آسان اصولِ فقہ



أبو عبد الرحمن
محمد رفیق طاہر

مکتبۃ أهل الحدیث
www.ahlulhdeeth.net

نام کتاب:............ تسہیل الوصول إلی فہم علم الأصول
مؤلفین:......عطیہ محمد سالم، عبدالمحسن العباد، حمود بن عقلا
مترجم:.............................. محمد رفیق طاہر حفظہ اللہ
کمپوزنگ: .... محمد زبیر شیخ آزاد
ناشر:.......................مکتبہ اسلامیہ
اشاعت اولی:...............................ذیقعدہ ۱۴۳۲ھ
تعداد: ۱۱۰۰
قیمت:...................................۱۵۰ روپے

عرض مترجم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين ، أما بعد !

زیر نظر کتاب "تسہیل الوصول الی فہم علم الاصول" تین فاضل مشایخ : عطیہ محمد سالم ، عبد المحسن العباد ، اور حمود بن عقلا کی تصنیف لطیف ہے جس پر شیخ عبد الرزاق عفیفی نے نظر ثانی کی ہے۔ یہ کتاب دینی مدارس میں داخل نصاب بھی ہے اور اصول فقہ کو سمجھنے کے لیے آسان عام فہم اور بہترین راہنما بھی۔ ہمارے ادارہ جامعہ دار الحدیث المحمدیہ ملتان میں بھی یہ کتاب نصاب میں شامل ہے اور ہر سال پڑھائی جاتی ہے۔ گزشتہ سال مجھے یہ کتاب پڑھانے کا موقعہ ملا تو میں نے اس کتاب کی افادیت کی بناء پر طلبہ کو اسکا ترجمہ ساتھ ساتھ تحریر کرنے کا مشورہ دیا، کلاس میں جو ترجمہ اس کتاب کا میں بیان کرتا طلبہ اسے کاپیوں پر لکھ لیتے، ہمارے فاضل تلمیذ محمد زبیر آزاد نے اس ترجمہ کو بہترین انداز میں جمع کیا اور پھر اسے یونیکوڈائز بھی کر دیا ۔ جسکے بعد میں نے اسے مکمل طور پر دوبارہ پڑھا اور غلطیوں اور خامیوں کی اصلاح کی، سقط کا ازالہ کیا، اور جہاں کوئی اہم ترین بات کی وضاحت یا نقد کی ضرورت محسوس ہوئی بین القوسین کچھ اضافات بھی کر دیے۔ یاد رہے کہ ان مقامات کے علاوہ بھی اس کتاب اور اصول فقہ کی دیگر کتب پر ہمارے ملاحظات ہیں، لیکن طوالت کے ڈر سے انہیں یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ ان تمام تر باتوں کو ہم علم اصول پر اپنی مستقل

کتاب" أصل الأصول "میں ذکر کریں گے، جہاں ہم اصول فقہ اور اصول حدیث کے تمام تر قوانین کو خالصتا کتاب وسنت کے دلائل سے ثابت کریں گے، اور باطل اصولوں کا رد بھی کریں گے۔ان شاء اللہ تعالی۔

ہم محترم جناب سرور عاصم صاحب، مدیر مکتبہ اسلامیہ لاہور کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو حسب عادت اعلی ترین معیار قائم رکھتے ہوئے زیور طباعت سے آراستہ کیا اور شائقین علم کے لیے ملک کے اطراف واکناف میں پھیلانے کا اہتمام فرمایا۔

ہم اللہ تعالی سے دعاء گو ہیں کہ وہ ہماری اس ادنی سی کاوش کو اپنی بارگاہ میں مقبول ومنظور فرمائے، اور اسکے مصنفین، مترجم، ناشر اور تمام معاونین کے لیے ذخیرہ آخرت بنادے۔ آمین یارب العالمین۔

ابو عبد الرحمن محمد رفیق طاہر
مدرس جامعہ دار الحدیث محمدیہ
عام خاص باغ ملتان

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

اصول فقہ کی تعریف

جان لیجئے کہ یقیناً ''اصول فقہ'' مضاف اور مضاف الیہ سے مرکب ہے، 'اصول' مضاف اور 'فقہ' مضاف الیہ ہے، اس مرکب کا نام مرکب اضافی رکھا گیا ہے، پھر اس مرکب اضافی کو لے کر علم معہود (مقررہ ومشہور علم) پر بطور عَلَم کے رکھ دیا گیا ہے۔ پس اس کی تعریف اس کے مرکب اضافی اور عَلَم دونوں اعتبار سے لائق بیان ہے۔

① مرکب اضافی ہونے کے اعتبار سے تعریف:

چونکہ یہ مرکب دو کلموں سے مل کر بنا ہے، لہٰذا دونوں کی علیحدہ علیحدہ وضاحت کی جاتی ہے۔

ا۔ **لفظ اصول:** اصول، اصل کی جمع ہے اور لغت میں اصل اس کو کہتے ہیں جس پر کسی دوسرے کی بنیاد ہو جیسے کہ چھت اور دیوار کے لیے "بنیاد" اصل ہے، اسی طرح درخت کی جڑیں جو زمین میں ثابت ہیں، درخت کے لیے اصل ہیں، جیسا کہ یہ بات خود اللہ تعالیٰ کے فرمان میں موجود ہے: ''﴿ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴾ [إبراهيم: ٢٤] ''

ترجمہ: اس کی اصل (زمین میں) ثابت ہے اور شاخ آسمان سے باتیں کرتی ہے۔

اصطلاح میں اصل کا لفظ کئی معنوں کے لیے بولا جاتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

ا۔ **عام قاعدہ:** جیسے اصولیوں کی یہ بات ہے کہ ''امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے''

اس قاعدہ کی وضاحت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کرتا ہے: ''﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ﴾ [الحشر: ٧] ''

ترجمہ: جو کچھ بھی تمہیں اللہ کے رسول ﷺ دے دیں اسے لے لو۔

تو اس آیت میں دیا گیا یہ عام حکم ہے جو ہر اس چیز کو لینے کے وجوب کا تقاضا کرتا ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں دی ہے، بغیر اس کے کہ ہم ان احکام کے افراد میں سے کسی فرد کی ذات کے پیچھے پڑ جائیں جن احکام کی طرف اللہ کے رسول ﷺ نے ہماری رہنمائی کی ہے۔

۲۔ **دلیل:** اصل کا لفظ دلیل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے آپ یہ کہتے ہیں کہ روزے کے فرض ہونے کی اصل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ” ﴿ يا أَيهَا الَّـــذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيكُمُ الصِّيامُ ﴾ [البقرة:۱۳۸] “

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔

یعنی روزوں کے فرض ہونے کی دلیل مندرجہ بالا فرمانِ الٰہی ہے۔

۲۔ **لفظ فقہ:** لغت میں فقہ 'سمجھ' کو کہتے ہیں۔ اسی معنوں میں اللہ رب العالمین کا یہ فرمان گرامی بھی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل کیا گیا ہے: ” ﴿ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّـــسَانِي (۲۷) يفْقَهُوا قولي ﴾ [طه:۲۷،۲۸]“

ترجمہ: اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے (تاکہ) وہ میری بات کو سمجھ لیں۔

یعنی اس کا فہم حاصل کر لیں۔

اصطلاح میں ان احکام شرعیہ کے علم کا نام فقہ ہے جن احکام کا ذریعہ اجتہاد ہوتا ہے۔

تو **اصول فقہ** سے مراد ”فقہ کے وہ قاعدے ہیں جن پر فقہ کی بنیاد ہے۔“

فقہ کی تعریف کی شرح:

۱۔ علم سے مراد وہ چیز ہے جو غلبہ ظن پر مشتمل ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں علم کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے: ”﴿ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ ﴾ [الممتحنة:۱۰]“

ترجمہ: تو اگر تم انہیں مؤمنہ عورتیں سمجھو۔

یعنی گمان کرو۔

۲۔ **احکام شرعیہ سے مراد** وجوب، ندب، حرمت، کراہت یا اباحت ہے۔ تو شرعیہ کی قید لگانے سے علوم عقلیہ، جیسے ایک دو کا نصف ہوتا ہے، علوم حسیہ، جیسے برف ٹھنڈی ہوتی ہے اور علوم عادیہ جیسے کڑک اور بجلی کے بعد بارش ہوتی ہے، نکل جاتے ہیں۔

۳۔ **احکام شرعیہ 'جن کا ذریعہ اجتہاد ہے**، سے ان احکام کو نکالنا مقصود ہے جن میں اجتہاد نہیں ہو سکتا جیسے نماز اور روزے کے واجب اور زنا اور چوری کے حرام ہونے کے بارے میں جاننا ہے کیونکہ دین میں ان کی معرفت ضروری ہے۔

(۲) اصول فقہ کی تعریف بطور لقب:

یہ ایسا علم ہے جو فقہ کی اجمالی دلیلوں کے حالات ' ان دلیلوں سے فائدہ حاصل کرنے کے طریقوں اور فائدہ حاصل کرنے والے کے حالات کے بارے میں بحث کرتا ہے۔

اس تعریف کی وضاحت :

۱۔ فائدہ حاصل کرنے کے طریقوں سے مراد: مثال کے طور پر تعارض کے وقت ترجیح کو پہنچاننا ۔

۲۔ اور اجمالی دلیلوں سے مراد: وہ دلائل ہیں جو تفصیلی نہ ہوں' جیسے کہ امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے، اور نہی تحریم کا ، مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا، عام کی تخصیص خاص سے ہو گی ، اجماع اور قیاس حجت ہیں۔

اس علم کا موضوع :

اس علم کا موضوع وہ دلائل ہیں جو فقہ کی پہچان کرواتے ہیں اور دلیل کی حالت کی معرفت کے ساتھ ساتھ ان دلائل سے احکام پر استدلال کرنے کی کیفیت بتلاتے ہیں۔

اس علم کا فائدہ :

اس علم کا فائدہ ان احکام کا علم حاصل کرنا ہے جو اپنے اندر دونوں جہانوں کی سعادت کے کامیاب حصول کو سموئے ہوئے ہیں۔

اس علم کے ماخذ:

اس علم کے تین ماخذ ہیں:

۱۔ **اصول دین کا علم:** یعنی توحید کا علم' کیونکہ شرعی دلائل اللہ کی معرفت اور نبی ﷺ کی سچائی کی پہچان پر موقوف ہیں۔ اور یہ دونوں اس علم کی مباحث میں دلائل کے ساتھ واضح ہیں

۲۔ **عربی لغت کا علم:** کیونکہ قرآن و سنت کا فہم اور ان دونوں سے استدلال ان کی معرفت اور پہچان پر موقوف ہے ، جبکہ یہ دونوں (کتاب و سنت) عربی زبان میں ہیں۔

۳۔ **احکام شرعیہ کا تصور:** چونکہ اس علم کو حاصل کرنے کا مقصد شرعی احکام کو یا تو ثابت کرنا ہے یا ان کی نفی کرنا ہے اور یہ کام اسی وقت ممکن ہے جب ان کا تصور ذہن میں ہو کیونکہ کسی چیز پر حکم لگانا اس کے تصور کی فرع ہے۔

اس علم کو حاصل کرنے کا حکم :

اصول فقہ کو سیکھنا اور سکھانا فرض کفایہ ہے۔

احکام شرعیہ:

آپ جان چکے ہیں کہ شرعی احکام کا علم 'فقہ' کہلاتا ہے۔ درج ذیل میں ان احکام کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

حکم کی تعریف:

لغوی طور پر حکم کا مطلب ہے: روکنا

اور اصطلاحی طور پر مکلفین کے افعال سے متعلق اللہ تعالیٰ کے خطاب کے تقاضے کو حکم کہتے ہیں۔

حکم شرعی کی اقسام:

احکام شریعت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ حکم تکلیفی ۲۔ حکم وضعی

① حکم تکلیفی: مطالبے اور اختیار کے اعتبار سے مکلف بندوں کے افعال سے متعلق اللہ تعالیٰ کے خطاب کے تقاضے کو حکم تکلیفی کہتے ہیں۔

② حکم وضعی: وہ اسباب، شرائط اور موانع (رکاوٹیں) جن کو شارع نے وضع کیا ہے، جن کی موجودگی میں احکام شریعت نفی یا اثبات کے اعتبار سے پہچانے جاتے ہیں۔

حکم تکلیفی اور حکم وضعی میں فرق:

حکم تکلیفی اور حکم وضعی میں فرق یہ ہے کہ:

حکم تکلیفی اپنے مخاطب کو اپنے تقاضے کے مطابق کام کے کرنے یا چھوڑنے کا مکلف ٹھہراتا ہے، جبکہ حکم وضعی کام کے کرنے یا چھوڑنے کے لیے کچھ علامتیں یا اوصاف مقرر کرتا ہے۔

حکم تکلیفی کی اقسام:

حکم تکلیفی کی پانچ قسمیں ہیں:

کیونکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو حکم میں کسی کام کے کرنا کا مطالبہ ہوتا ہے یا چھوڑنے کا۔ اور یہ دونوں (کام کے کرنے یا چھوڑنے کا مطالبہ) یا تو حتمی طور پر ہوتا ہے یا حتمی (ضروری)طور پر نہیں ہوتا۔ یا پھر اس کام کے کرنے اور نہ کرنے کے درمیان اختیار ہوتا ہے۔

ان سب کی تفصیل درج ذیل ہے:

١۔ جس خطاب میں فعل کو حتمی طور پر طلب کیا جاتا ہے (اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے)' اسے ایجاب اور اس کے متعلق کو واجب کہتے ہیں۔

٢۔ جس خطاب میں فعل کو حتمی اور لازمی طور پر طلب نہ کیا گیا ہو، اس کو ندب اور اس کے متعلق کو مندوب کہتے ہیں۔

٣۔ جس خطاب میں کام کے چھوڑنے کا حتمی طور پر مطالبہ کیا گیا ہو، اسے تحریم اور اس کے متعلق کو محرم کہتے ہیں۔

٤۔ جس خطاب میں کام کے چھوڑنے کا حتمی طور پر مطالبہ نہ کیا گیا ہو، اسے کراہت اور اس کے متعلق کو مکروہ کہتے ہیں۔

٥۔ جس خطاب میں کام کے کرنے اور نہ کرنے کے درمیان اختیار دے دیا جائے، اسے اباحت اور اس کے متعلق کو مباح کہتے ہیں۔

نوٹ: اہل اصول فقہ اب مباح کو حکم تکلیفی میں شمار کرنے لگے ہیں جبکہ یہ درست نہیں ، کیونکہ اس کے دونوں اطراف (کام کے کرنے یا چھوڑنے کے) برابر ہونے کی وجہ سے اس میں تکلیف (پابندی) نہیں ہوتی۔

١۔ واجب:

لغت میں واجب 'ثابت' اور 'لازم' کو کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”﴿ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا ﴾ [الحج: ٣٦]“

ترجمہ: تو جب ان (اونٹوں) کے پہلو زمین سے لگ جائیں تو ان میں سے کھاؤ۔

اور شاعر کہتا ہے:

أطاعت بنو بكر أميرًا نهاهموا عن السلم حتى كان أول واجب

ترجمہ: بنو بکر نے ایسے امیر کی اطاعت کی جس نے انہیں صلح سے اس وقت تک روک رو کے رکھا جب تک ان کا پہلا آدمی نہیں گرا (یعنی مقتول ہوا)۔

اصطلاح میں واجب اس حکم کو کہتے ہیں جس کے سر انجام دینے والے کو فرمانبرداری کی وجہ سے ثواب ملے اور چھوڑنے والا سزا کا مستحق ٹھہرے۔

واجب کی اقسام:

① **فاعل کے اعتبار سے** واجب کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ فرض عین ۲۔ فرض کفایہ

۱۔ **فرض عین:** اگر فعل ہر ہر بندے سے مطلوب ہو تو اسے فرض عین کہتے ہیں جیسا کہ پنجگانہ نمازیں ہیں۔

۲۔ **فرض کفایہ:** اگر بعض افراد کے کام کرنے پر فعل ادا ہو جائے یعنی کفایت کر جائے تو اسے فرض کفایہ کہتے ہیں جیسے نمازِ جنازہ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ شارع اس (فرض کفایہ) میں کام کرنے والوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ صرف فعل کا سر انجام دیا جانا چاہتا ہے، چاہے کرنے والا کوئی بھی ہو۔

② **وقت کے محدود ہونے کے اعتبار سے بھی** اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مضیق ۲۔ موسع

۱۔ **مضیق:** اگر دیئے گئے وقت میں صرف وہی فعل ہو سکے اور اس کی جنس میں سے (یعنی اس جیسا) کوئی اور کام نہ ہو سکے تو اسے مضیق کہتے ہیں۔

جیسا کہ رمضان میں روزے کا وقت کیونکہ روزے کا وقت طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہے۔ لہٰذا اس فرضی روزے کے ساتھ کوئی نفلی روزہ نہیں رکھا جاسکتا (کیونکہ وقت اتنا ہی ہوتا ہے جس میں صرف فرضی روزہ رکھا جاسکتا ہے۔)

اسی طرح نمازوں کے آخری اوقات جن میں صرف فرض نماز ادا ہوسکتی ہے جیسے صبح کے وقت طلوع آفتاب سے بالکل تھوڑا سا پہلے کا وقت اور عصر کے لیے غروبِ آفتاب سے تھوڑا سا پہلے کا وقت۔

۲۔ **موسع:** اگر مطلوبہ فعل کے ساتھ اسی کی جنس کا کوئی اور فعل بھی سرانجام دیا جاسکے تو اس واجب کو موسع کہتے ہیں۔

جیسا کہ پنجگانہ نمازوں کے اوقات کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے وقت میں ان کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ نوافل بھی ادا کی جاسکتے ہیں۔

③ **فعل کے اعتبار سے** بھی واجب کی دو ہی قسمیں ہیں:

ا۔ معین ۲۔ مبہم

ا۔ **معین:** اگر کوئی فعل بعینہ مطلوب ہو، کوئی اور فعل اسکا قائم مقام نہ بن سکے تو اسے معین کہتے ہیں جیسا کہ نماز، روزہ اور حج وغیرہ۔

۲۔ **مبہم:** اگر چند ایک کام بتا کر کہا جائے کہ ان میں سے کوئی کرلو اور وہ کفایت کر جائے گا تو اسے مبہم کہتے ہیں۔

جیسا کہ قسم کا کفارہ ہے کہ گردن آزاد کرنے، کھانا کھلانے یا روزے رکھنے میں سے کوئی بھی ایک کام کرسکتے ہیں، کیونکہ ان میں سے صرف ایک کام کرنا واجب ہے نہ کہ سارے۔

۲۔ مندوب:

لغت میں مندوب، ندب سے اسم مفعول کا صیغہ ہے، جس کا مطلب ہے: کسی کام کے لیے پکارنا اور بلانا، بقول شاعر

لا يسألون أخاهم حين يندبهم ‌ ‌ ‌ ‌ في النائبات على ما قال برهانا

ترجمہ: وہ (بنو مازن قبیلے والے) اپنے بھائی سے اس کی بات کی دلیل کا مطالبہ نہیں کرتے جب وہ انہیں مشکلات میں پکارتا ہے۔

اصطلاح میں مندوب اسے کہتے ہیں: جس کے کرنے والے کو ثواب ملے اور نہ کرنے والے پر گرفت نہ کی جائے اور شارع نے اس کا مطالبہ غیر حتمی طور پر کیا ہو۔

یہ سنت، مستحب اور تطوع کے مترادف ہے۔

اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مندوب بھی اصل میں مامور بہ ہوتا ہے (یعنی اس کا حکم دیا گیا ہوتا ہے) ان کے دلائل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے یہ فرامین گرامی ہیں:

۱۔ ﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى﴾ [النحل: ۹۰]

ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتے ہیں۔

۲۔ ﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ [لقمان: ۱۷]

ترجمہ: اچھائی کا حکم کرو۔

۳۔ ﴿ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ ﴾ [الأعراف: ۱۹۹]

ترجمہ: نیک کام کا حکم دو۔

ان مذکورہ بالا آیات میں جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے بعض مندوب ہیں۔

اسی طرح جمہور کے مذہب کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ امر طلب اور درخواست ہے اور مندوب مطلوب ومقصود ہے لہٰذا وہ (مندوب) مامور بہ ہوتا ہے۔

۳۔ محظور:

لغت میں محظور اس کو کہتے ہیں جس سے منع کیا گیا ہو،

اور اصطلاح میں محظور اسے کہتے ہیں جس کے چھوڑنے والے کو فرمانبرداری کی وجہ سے ثواب ملے اور کرنے والے کو گناہ، جیسے زنا، چوری، شراب نوشی، سگریٹ نوشی، شیو اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔

اسے محرم، معصیت، گناہ اور حجر (ممنوع) بھی کہا جاتا ہے۔

۴۔ مکروہ:

لغوی اعتبار سے مکروہ محبوب (پسندیدہ) کا متضاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:
﴿ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيكُمُ الإيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيانَ ﴾ [الحجرات:۷]

ترجمہ: لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے اور کفر، گناہ اور نافرمانی کو تمہارے نگاہوں میں ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔

اصطلاحی اعتبار سے مکروہ اسے کہتے ہیں: جس کے چھوڑنے والے کو فرمانبرداری کی وجہ سے ثواب ملے اور کرنے کی وجہ سے گناہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر: مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے بایاں پاؤں رکھنا اور نکلتے وقت پہلے دایاں پاؤں نکالنا۔

۵۔ مباح:

جس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اسے لغت میں مباح کہتے ہیں، جیسا کہ کہا گیا ہے:

ولقد أبحنا ما حميت ولا مبيح لما حمينا

ترجمہ: یقیناً ہم نے اس کو حلال (مباح) کر لیا جس کی حفاظت کرنے کی تو نے کوشش کی اور جس کی ہم حفاظت کریں اس کو کوئی حلال نہیں کر سکتا۔

اصطلاح میں ہر اس خطاب کو مباح کہتے ہیں جس میں کام کرنے یا چھوڑنے کے درمیان اختیار ہو، لہٰذا نہ تو کام کرنے پر کوئی ثواب ہو اور نہ چھوڑنے پر کوئی گناہ ہو، جیسا کہ کھانا، پینا، سونا، ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے نہانا۔

ایسا اس وقت تک ہوتا ہے جب تک اس میں نیت کو دخل نہ دیا جائے لیکن اگر مباح کام کرتے وقت نیکی کی نیت کر لی جائے تو اس کا اجر ضرور ملے گا۔

حکم وضعی کی اقسام:

۱۔ سبب:

لغت میں سبب اسے کہتے ہیں: جس کے ذریعے اس کے غیر تک پہنچا جائے۔

اصطلاح میں سبب اسے کہتے ہیں: جس کے وجود سے (حکم کا) وجود لازم آئے اور اس کے عدم سے اس (حکم) کی ذات کا عدم لازم آئے۔

مثال کے طور پر سورج کا ڈھلنا، کیونکہ یہ ظہر کی نماز کے واجب ہونے کا سبب ہے اور اسی طرح نصاب زکاۃ کی ملکیت کیونکہ یہ زکاۃ کے وجوب کا سبب ہے اور اسی طرح ولاء اور نسب میراث حاصل کرنے کا سبب ہے۔

۲۔ شرط:

لغت میں شرط، شروط کا واحد ہے شَرَطٌ سے ماخوذ ہے جو اشراط کی واحد ہے جس سے مراد علامت اور نشانی ہے۔

اصطلاح میں شرط اس کو کہتے ہیں کہ جس کے عدم سے (حکم کا) عدم لازم آئے اور اس (شرط) کے وجود سے (حکم کا) وجود اور خود اس (شرط) کا عدم لازم نہ آئے۔

جیسا کہ طہارت (وضو اور غسل وغیرہ) کیونکہ نماز کے صحیح ہونے کے لیے طہارت شرط ہے، لہٰذا طہارت کی عدم موجودگی میں شرعی نماز کا وجود بھی معدوم ہوگا۔ لیکن طہارت کا وجود نماز کے وجود کو لازم نہیں کرتا کیونکہ بسا اوقات انسان طہارت حاصل کرلیتا ہے لیکن نماز پڑھنے سے رکا رہتا ہے۔

۳۔ مانع:

لغت میں رکاوٹ کو مانع کہتے ہیں۔

اصطلاح میں اسے مانع کہتے ہیں کہ جس کے وجود سے (حکم کا) عدم لازم آئے، اور اس کے عدم سے (حکم کا) وجود اور خود اس (مانع) کا عدم لازم نہ آئے۔

جیسا کہ قتل میراث کے حصول میں مانع ہے اور حیض نماز کی ادائیگی سے مانع ہے۔
کیونکہ جب بھی قتل کا وجود پایا جائے گا میراث ممتنع ہو جائے گی اور جب بھی حیض پایا جائے گا نماز کی ادائیگی ممنوع ہو جائے گی۔ اور کبھی کبھی یہ دونوں (قتل اور حیض) پائے نہیں جاتے اور ان کا نہ پایا جانا میراث کے حصول اور نماز کی ادائیگی کو لازمی نہیں بناتا۔
لہٰذا یہ شرط کے برعکس ہے کیونکہ شرط میں مشروط کی موجودگی شرط کی موجودگی پر موقوف ہوتی ہے اور مانع اس کے وجود کی نفی کرتا ہے۔
سبب، شرط اور مانع میں فرق کو واضح دیکھنے کے لیے زکاۃ کے مال کی طرف دیکھئے:
اگر مال نصابِ زکاۃ تک پہنچ جائے تو یہ زکاۃ کے فرض ہونے کے لیے سبب ہو گا، اس مال پر سال کا گزرنا شرط ہے اور اگر قرضہ موجود ہو تو یہ مانع ہو گا، ان لوگوں کے قول کے مطابق کہ قرضہ مانع ہے۔

صحیح اور فاسد:

صحیح: لغت میں سقیم (بیمار) کے متضاد کو صحیح کہتے ہیں۔
اصطلاح میں صحیح اسے کہتے ہیں: عبادت کا درست ہونا اور معاملات کا فافذ ہونا متعلق جس سے ہو۔
مثال کے طور پر (شرعی) نماز اس وقت واقع (صحیح) ہوتی ہے جب اس میں شرائط مکمل طور پر پائی جائیں، ارکان مکمل طور پر ادا کیے جائیں اور موانع ختم ہو جائیں، اگرچہ یہ سب کچھ فاعل کے خیال میں ہی ہو، اسی طرح تجارت بھی ایسے شخص کی صحیح (واقع) ہوتی ہے جو مباح چیز پر اختیار رکھتا ہو اور اسے سپرد کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور وہ چیز حقیقت میں اس کی ملکیت ہو، تو اگر بائع (بیچنے والا) ایسی چیز کو بیچے جس کے بارے میں اس کا گمان یہ ہو کہ یہ چیز کسی اور کی ملکیت میں ہے لیکن پھر اس پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ واقعی وہ چیز اسی (بائع) کی تھی تو بیع (تجارت) صحیح ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاملات حقائق پر مبنی ہوتے ہیں اور عبادات فاعل کے اعتقاد پر۔
فاسد: لغت میں فاسد ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی خرابی ہو۔

اصطلاح میں ایسی چیز کو فاسد کہتے ہیں : کہ جس کے ساتھ عبادت کی ادائیگی اور معاملات کا نفاذ نہ ہو۔ عبادات کی مثال جیسا کہ نماز کو اس کے وقت سے پہلے پڑھ لینا، اور معاملات کی مثال جیسا کہ ایسی چیز کو بیچنا جو بندہ کی ملکیت ہی نہ ہو۔

سب کے نزدیک باطل فاسد کا ہم معنی (مترادف) ہے، سوائے ابو حنیفہ کے کہ وہ ان دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں، ان کے نزدیک فاسد وہ ہے جو اصل میں تو جائز ہو لیکن کسی وصف کی وجہ سے ممنوع ہو جائے جیسا کہ ایک مد گندم کی بیع ایک مد گندم اور ایک درہم کے بدلے کرنا۔ ایک مد گندم کی تجارت ایک مد کے بدلے تو جائز ہے (مگر یہ فاسد اس وقت ہوا جب دوسری طرف سے مُد کے ساتھ ایک درہم بھی لیا گیا) پس اگر درہم کو ختم کر دیا جائے تو اصل مشروعیت کو دیکھتے ہوئے سودا درست (صحیح) ہو گا۔

رخصت اور عزیمت:

عزیمت: لغت میں عزیمت 'پختہ ارادے' کو کہتے ہیں۔

اصطلاح میں اس حکم کو عزیمت کہتے ہیں جو کسی شرعی دلیل سے ثابت ہو اور اپنے سے معارض (مخالف) راجح دلیل سے خالی ہو۔ جیسا کہ زنا کا حرام ہونا منہیات (جن سے روکا گیا ہو) میں سے عزیمت ہے اور نماز کا واجب ہونا مامورات (جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہو) میں سے عزیمت ہے۔

رخصت: لغت میں نرمی اور سہولت کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: **شیء رخص** یعنی نرم چیز

اصطلاح میں رخصت اس حکم کو کہتے ہیں جو کسی راجح معارض کی وجہ سے شرعی دلیل کے خلاف ثابت ہو۔ جیسا کہ مریض کا اپنے مرض کی وجہ سے پانی کی موجودگی کے باوجود تیمم کرنا اور مجبوری کے وقت مردار کھانا (یہ رخصت ہے)۔

تیمم شرعی دلیل کے خلاف ثابت ہے۔ شرعی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ يا أَيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ ﴾ [المائدة:٦]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے (ہونے کا ارادہ کرو) تو اپنے چہروں کو دھو لو۔

اس کے خلاف جو راجح معارض ہے وہ اللہ رب العالمین کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاء أَحَدٌ مِّنكُم مِّن الْغَآئِطِ أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاء فَلَمْ تَجِدُواْ مَاء فَتَيَمَّمُواْ صَعِيداً طَيِّباً فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَفُوّاً غَفُوراً ﴾ [النساء: ٣٤]

ترجمہ: اور اگر تم مریض ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو یا عورتوں سے مباشرت کی ہو اور پانی نہ ملے تو پاکیزہ گرد و غبار سے تیمم کرلو، یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرلو، اللہ تعالیٰ یقیناً بہت درگزر کرنیوالا اور بہت زیادہ مغفرت کرنیوالا ہے۔

اسی طرح مجبور آدمی کا مردار کھانا بھی شرعی دلیل کے خلاف ثابت ہے۔ شرعی دلیل اللہ مالک الملک کا یہ فرمان گرامی ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيكُمُ الْمَيتَةُ ﴾ [المائدة: ٣]

ترجمہ: تم پر مردار حرام کردیا گیا ہے۔

اس (مردار) کو کھانے کی اجازت اس کے خلاف راجح دلیل کی وجہ سے دی گئی ہے جو رب ذوالجلال والاکرام کا یہ فرمان ہے: ﴿ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ [المائدة: ٣]

ترجمہ: تو جو بھوک کی وجہ سے مجبور ہو جائے، گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو تو (اس کے لیے مردار وغیرہ کھانا جائز ہے۔ کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ خوب بخشنے والا اور نہایت رحم کرنیوالا ہے۔

ایک مجبور شخص کا مردار کھا کر اپنی ذات سے موت (ہلاکت) کی طرف لے جانی والی بھوک کو دور کرلینا، مردار کی خباثت کی بناء پر حاصل ہونے والے نقصان کی نسبت کہیں زیادہ راجح (یعنی بہتر) ہے۔

کلام کی اقسام:

یہ بات معلوم ہے کہ کتاب وسنت ہی دین کی اصل اور اس کی بنیاد ہیں اور یہ بات بھی سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ دونوں (کتاب وسنت) فصیح عربی زبان میں ہیں تو ان دونوں کا علم حاصل کرنا خود عربی کلام اور اس کی متعدد اقسام کی واقفیت حاصل کر لینے پر موقوف ہے۔

کلام کی اقسام جاننے سے پہلے خود کلام کی تعریف کا جاننا زیادہ مناسب ہے کیونکہ کسی چیز کی اقسام کی معرفت خود اس کی اپنی معرفت (پہچان) کی فرع (شاخ) ہے۔

کلام کی تعریف:

کلام اطلاق دو چیزوں کے مجموعے پر ہوتا ہے:

۱۔ لفظ ۲۔ معنی

جیسا کہ قرآن مجید، تمام نازل شدہ آسمانی کتابیں اور احادیث قدسیہ، یہ سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، الفاظ اور معنی دونوں اعتبار سے۔

یہی اہل حق کا قول ہے۔ اور بدعتیوں کے ایک گروہ نے اس (کلام) کا اطلاق دل میں موجود معنی پر کیا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی تصریحات کی بناء پر مردود ہے۔

اگر بسا اوقات دل میں موجود معنی پر کلام کا اطلاق کیا جائے تو اس وقت اس کے ساتھ قید لگانا ضروری ہے جو اس بات پر دلالت کرے (کہ یہاں پر کلام سے مراد دل میں موجود معنی ہے) جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ﴾ [المجادلة:۸]

ترجمہ: اور وہ لوگ دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری باتوں کی وجہ سے ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟

تو اگر یہاں ﴿ فِي أَنفُسِهِمْ ﴾ کی قید نہ ہوتی تو اس سے زبان سے کہنا مراد لیا جاتا۔ اور کبھی کبھی لفظ کلام کا اطلاق ہر اس چیز پر کیا جاتا ہے جو مرادی معنی پر دلالت کرے (یا جس سے قائل کی مراد سمجھ میں آجائے) بقول شاعر:

إذا كلمتني بالعيون الفواتر ردت عليها بالدموع البوادر

ترجمہ: جب اس (محبوبہ) نے مجھ سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے کلام کی تو میں اس کو تیزی کے ساتھ بہتے ہوئے آنسوؤں سے جواب دیا۔

نحویوں کے ہاں کلام کا اطلاق اس مرکب لفظ پر ہوتا ہے جس کی ترکیب ایسی مفید ہو کہ (سامع کا)اس پر خاموشی اختیار درست ہو، جیسا کہ " مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ " ہے۔

سب سے کم وہ چیز (یعنی کلام) جس سے فائدہ حاصل ہوتا ہے:

ہر اس کلام سے فائدہ حاصل ہوتا ہے جو نسبت اسنادی پر مشتمل ہو اور کم از کم یہ چیز آنے والی تراکیب میں سے ہر ایک میں پائی جاتی ہے:

۱۔ دو اسموں پر مشتمل ترکیب، جیسا کہ مبتدا اور خبر سے مل کر بننے والی ترکیب، اس کی مثال "الله أحد، الله الصمد" ہے۔

۲۔ ایک فعل اور ایک اسم پر مشتمل ترکیب، جیسا کہ فعل اور فاعل سے مل کر بننے والی ترکیب، اس کی مثال "جاء الحق وزهق الباطل" ہے۔

۳۔ ایک اسم اور ایک حرف پر مشتمل ترکیب، جیسے "يا الله" ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ تیسری ترکیب اصل میں دوسری ترکیب ہی ہے کیونکہ اس میں موجود حرف فعل کا قائمقام ہے۔ اسی طرح وہ اکیلا لفظ جو اپنے ضمن میں مفید کلام کا معنی لیے ہوئے ہوتا ہے، اس سے بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے جیسے حروف ایجاب ہیں، مثلاً نعم، بلى، اسی طرح حرف نفی 'لا' اور جیسا کہ فعل امر ہے، مثلاً: استقم۔

کلام کی خبر اور انشاء میں تقسیم:

کلام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ خبر ۲۔ انشاء

① خبر کی تعریف:

جس کلام میں ذاتی طور پر سچ اور جھوٹ کا احتمال ہو، اسے خبر کہتے ہیں۔

ہمارا« سچ اور جھوٹ کا احتمال ہو » کہنا دراصل انشاء سے بچنا ہے کیونکہ اس میں سچ اور جھوٹ کا احتمال نہیں ہوتا۔ اور ہم نے « ذاتی طور» اس لیے کہا ہے تاکہ اس تعریف میں کلام اللہ اور بدیہی امور بھی شامل رہیں۔

کلام اللہ کی مثال: ﴿ أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ (١) حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴾ [التكاثر: ١، ٢]

ترجمہ: تمہیں کثرت کی چاہت نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھ لیں۔

بدیہی امور کی مثال: ایک، دو کا آدھا ہوتا ہے اور کل، جزء سے بڑا ہوتا ہے۔

خبر کی سچ اور جھوٹ میں تقسیم:

خبر سچ اور جھوٹ میں منقسم ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کلام کا مضمون واقع کے مطابق ہو تو وہ خبر سچ ہوگی خواہ نفی میں ہو یا اثبات میں۔

نفی کی مثال: جن کا سردار نہ ہو، ان کے جھگڑے لوگ طے نہیں کر پاتے۔

مثبت کی مثال: لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔

اور اگر کلام کا مضمون واقع کے خلاف ہو تو جھوٹ ہوتا ہے خواہ نفی میں ہو، جیسے: نفع بخش ایجادات کا علم سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خواہ اثبات میں ہو، جیسے: گھوڑا ہوائی جہاز سے زیادہ تیز دوڑتا ہے۔

انشاء کی تعریف:

وہ کلام جس میں ذاتی طور پر سچ اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو، جیسے ﴿ أَقِمِ الصَّلَاةَ ﴾ [لقمان : ١٧] "نماز قائم کر" اور ﴿ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ﴾ [لقمان : ١٣] "اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا"

اس کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ طلبی ۲۔ غیر طلبی

① **طلبی:** یہ انشاء کی وہ قسم ہے جس میں مطلوب کو طلب کیا جاتا ہے اور بوقت طلب مطلوب حاصل نہیں ہوا ہوتا۔

اس کی چند اقسام ہیں:

۱۔ **امر:** اس میں چیز کے پیدا کرنے کا مطالبہ ایسے صیغے کے ساتھ کیا جاتا ہے جو اس پر دلالت کرے، جیسے: «**أطع والديك**» اپنے والدین کی اطاعت کر۔

۲۔ **نہی:** اس میں کسی فعل سے رکنے کا مطالبہ ایسے صیغے سے کیا جاتا ہے جو اس پر دلالت کرے، جیسے: «**لا تقصر في واجبك**» اپنے کام (ذمہ داری) میں کوتاہی نہ کر۔

۳۔ **استفہام:** اس میں کسی چیز کے بارے میں سمجھانا طلب کیا جاتا ہے، جیسے: «**هل ذاكرت درسك؟**» کیا آپ نے اپنے سبق کو دہرالیا ہے؟

۴۔ **تمنی:** یہ ایسے کام کے طلب کرنے پر دلالت کرتا ہے جس کا ہونا یا تو ناممکن ہوتا ہے یا بہت مشکل، اس صیغے کے ساتھ جو اس بات پر دلالت کرے۔

ناممکن کی مثال: "**ليت شبابًا بيع فاشتريت**" کاش کہ جوانی بکتی تو میں اسے خرید لیتا۔

مشکل کی مثال: "**ليت المسلمين يتحدون**" کاش کہ مسلمان متحد ہو جائیں۔

۵۔ **ترجی:** جس میں مطلوب ممکن بھی ہو اور پسندیدہ بھی، ایسے صیغے سے طلب کیا جائے جو اس پر دلالت کرے، جیسے: «**لعل شباب المسلمين يتجهون إلى النهل من معين دينهم الحنيف**» ہو سکتا ہے کہ مسلمان نوجوان اپنے یکسو دین کے جاری چشمے سے سیراب ہونے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

۶۔ **عرض:** مطلوب کو نرمی سے طلب کرنے کو کہتے ہیں، جیسے آپ کا اپنے دوست سے کہنا: «**ألا تزور صديقك؟!**» کیا آپ اپنے دوست کی زیارت نہیں کریں گے؟

۷۔ **تحضیض:** جس میں مطلوب کو ابھار کر اور ترغیب دے کر طلب کیا جائے، جیسے: ﴿ **أَلا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ** ﴾ **[التوبة: ۳۱]**

ترجمہ: تم ایسی قوم سے کیوں نہیں لڑتے جنہوں نے اپنے وعدوں کو توڑ دیا اور رسول ﷺ کو نکالنے کا ارادہ کیا، حالانکہ شر انگیزی کی ابتداء کرنے والے بھی وہی ہیں۔

② **غیر طلبی:** جیسے عقود (معاملات) کے صیغے، مثلاً: بعت واشتریت وزوجت وغیرہ، جب ان سے معاملات کو جاری کرنا مراد ہو، اسی طرح قسم کے صیغے، مثلاً: «**واللہ لأصدقن في الحدیث**» اللہ کی قسم! میں سچ بولوں گا۔ اور مدح (تعریف بیان کرنے) کے صیغے، مثلاً: «**نعم الطالب المجد**» مجد کتنا ہی اچھا طالب علم ہے۔ اور اسی طرح ذم (مذمت بیان کرنے) کے صیغے، مثلاً: «**بئست الصفة الحسد**» حسد کتنی ہی بری عادت ہے۔

حقیقت اور مجاز میں کلام کی تقسیم:

سب سے پہلے تو یہ جان لیجئے کہ حقیقت اور مجاز میں کلام کی تقسیم کے بارے میں لوگوں کی تین آراء ہیں:

۱۔ پہلی رائے ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ مجاز نہ تو قرآن میں ہے اور نہ ہی لغت عربی میں۔ گویا ان کے نزدیک حقیقت اور مجاز کی تقسیم ہی غلط ہے۔ یہ ابو اسحاق الاسفرائینی کا مذہب ہے اور اسی کی تائید شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: ''حقیقت اور مجاز کی اصطلاح ہی نئی ہے جو پہلی تین صدیاں گزر جانے کے بعد پیدا ہوئی ہے جس کے بارے میں نہ تو صحابہ نے کلام کیا ہے، نہ نیک نیتی سے ان کی پیروی کرنے والے تابعین نے اور نہ ہی علم مشہور ائمہ جیسے امام مالک، ثوری، اوزاعی، ابو حنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے، بلکہ اس کے بارے میں تو لغت اور نحو کے اماموں جیسے خلیل، سیبویہ، ابو عمرو بن العلاء اور ان جیسے دوسرے ائمہ میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔'' یہاں تک کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کہا کہ: ''امام شافعی نے سب سے پہلے اصول فقہ کو مدون کیا ہے لیکن انہوں نے نہ تو اس طرح کی کوئی تقسیم کی ہے اور نہ ہی حقیقت اور مجاز کا لفظ استعمال کیا ہے''

۲۔ دوسری رائے ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ قرآن میں تو مجاز نہیں ہے البتہ لغت میں موجود ہے۔ اس بات کو (شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے) کتاب الایمان میں حنابلہ میں سے ابو الحسن الجزری اور ابن حامد، مالکیہ میں سے محمد بن خویز منداد اور ظاہریوں میں سے داؤد بن علی الظاہری اور ان کے بیٹے ابو بکر کی طرف منسوب کیا ہے۔

۳۔ تیسری رائے ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ مجاز قرآن میں بھی ہے اور لغت میں بھی۔ یہ رائے حنابلہ میں سے ابو یعلی، ابن عقیل، ابو الخطاب اور ان کے علاوہ چند دوسرے لوگوں کی ہے۔ اسی رائے کو ابن قدامہ نے روضۃ الناظر میں راجح قرار دیا ہے اور اسی رائے کو امام زرکشی نے اپنی کتاب 'البرہان فی علوم القرآن' میں جمہور کی طرف منسوب کیا ہے۔

کلام کی حقیقت اور مجاز میں تقسیم سے متعلقہ مختصر گفتگو آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے، ان لوگوں کی طرف سے جو اس تقسیم کو جائز سمجھتے ہیں۔

حقیقت:

لغوی طور پر حقیقت کا لفظ حق سے لیا گیا ہے جو اگر فاعل کے معنی میں ہو تو اس کا مطلب 'ثابت' ہوتا ہے، اور اگر مفعول کے معنی میں ہو تو اس کا مطلب مُثْبَت (ثابت شدہ) ہوتا ہے۔

اصطلاح میں: تخاطب کی اصطلاح میں جو لفظ ابتدائی طور پر جس معنی کے لیے بنایا گیا ہو، اسی میں استعمال ہو تو اسے حقیقت کہتے ہیں، جیسے 'اسد' کا لفظ چیر پھاڑ کرنے والے درندے کے لیے وضع کیا گیا ہے، اسی طرح 'شمس' روشن ستارے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

کلمہ '**تخاطب کی اصطلاح**' سے یہ بات ہمارے لیے واضح ہوتی ہے کہ حقیقت کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ لغوی ۲۔ عرفی ۳۔ شرعی

① **حقیقت لغوی:** یہ وہ استعمال ہونے والا لفظ ہے جو اسی معنی میں استعمال ہو جس معنی کے لیے یہ پہلی مرتبہ لغت میں وضع ہوا تھا، جیسے 'اسد' چیر پھاڑ کرنے والے درندے کے لیے وضع ہوا ہے۔

② **حقیقت عرفی:** اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ حقیقت عرفیہ عامہ ۲۔ حقیقت عرفیہ خاصہ

۱۔ **حقیقت عرفیہ عامہ:** وہ حقیقت عرفی ہے جو عام اہل لغت کے ہاں لفظ کے اپنے ہی بعض مدلول پر بہت زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے یا مجاز کے حقیقت پر غالب ہونے کی وجہ سے متعارف ہو۔

پہلے اعتبار سے: اصل لغت میں کوئی لفظ کسی عام معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو، پھر عرف اس لفظ کو اس عام کے کچھ افراد کے لیے خاص کر دے جیسے: دابۃ کا لفظ ہے، اصل لغت میں یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے بنایا گیا تھا جو زمین کی سطح پر رینگ کر چلے، پھر عرف نے اسے چوپائیوں کے لیے مخصوص کر دیا۔

دوسرے اعتبار سے: اصل لغت میں تو لفظ کسی اور معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو لیکن پھر وہ عرف میں استعمال کی وجہ سے مجازی معنی میں اتنا مشہور ہو جائے کہ اس کے بولنے سے بس وہ مجازی معنی ہی سمجھ آئے، جیسے: غائط کا لفظ ہے، اصل لغت میں تو یہ اس جگہ کے لیے وضع کیا گیا جہاں اطمینان حاصل ہو لیکن پھر یہ انسان سے نکلنے والے فضلہ کے لیے استعمال ہونے لگا، اسی طرح 'راویہ' کا لفظ ہے جو اصل میں اس اونٹ کے لیے وضع کیا گیا تھا جس کے ذریعے پانی پلایا جاتا تھا، پھر یہ مشکیزے کے لیے استعمال ہونے لگ گیا۔

۲۔ **حقیقت عرفیہ خاصہ:** وہ الفاظ جو کسی خاص گروہ کے ہاں ان معانی کے لیے متعارف ہوں جو انہوں نے بنائے ہیں، جیسے نحویوں کا عرف ہے، رفع، نصب اور جر کا استعمال وہ ان خاص معنوں میں کرتے ہیں جو انہوں نے وضع کیے ہیں۔ اسی طرح بلاغت والوں کا مسند اور مسند الیہ کے بارے میں عرف ہے۔ اسی طرح دوسری مثالیں بھی ہیں۔

③ **حقیقت شرعی:** جو لفظ شریعت میں پہلے پہل جس معنی کے لیے وضع کیا گیا تھا، اسی معنی میں استعمال ہو۔ جیسے: صلاۃ کا لفظ، اس مخصوص عبادت کے لیے وضع کیا گیا ہے جو تکبیر سے شروع ہوتی ہے اور سلام کے ساتھ ختم ہوتی ہے، اسی طرح ایمان کا لفظ ہے جو قول، فعل اور اعتقاد کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

مجاز:

لغت میں مجاز جواز کی جگہ کہتے ہیں یا اگر اسے مصدر میمی مان لیا جائے تو صرف جواز کو کہتے ہیں۔

اصطلاح میں اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ لغوی ۲۔ عقلی

① **مجاز لغوی:** ایسا لفظ جسے کسی قرینہ کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اس معنی، جس کے لیے اسے وضع کیا گیا تھا کے علاوہ دوسرے معنی میں استعمال کیا جائے۔

اس کی مثال: لفظ 'اسد' کا بہادر آدمی کے لیے استعمال ہونا ہے کیونکہ یہ اس معنی کے علاوہ میں استعمال ہوا ہے جس کے لیے اس کو پہلی مرتبہ بنایا گیا تھا۔ دراصل اس لفظ کو چیر پھاڑ کرنے والے درندے کے لیے بنایا گیا تھا، پھر اس کے پہلے محل سے گزار کر اس کو بہادر آدمی کے لیے استعمال کیا گیا۔

تعلق اور اس کی غرض:

مجاز میں علاقہ یعنی تعلق کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے تاکہ اگر لفظ کو بھول کر یا غلطی سے اس معنی کے علاوہ دوسرے معنی میں استعمال کیا جائے تو اس بھول یا غلطی کو مجاز کی تعریف سے نکالا جاسکے۔ مثال کے طور پر آپ کہیں کہ قلم پکڑاؤ اور اشارہ کتاب کی طرف کریں۔ اسی طرح اگر جان بوجھ کر بھی لفظ کو غیر ما وضع لہ استعمال کیا جائے اور ان دونوں معنوں میں کوئی تعلق اور مناسبت نہ ہو تو اسے بھی مجاز کی تعریف سے نکالا جاسکے۔ مثال کے طور پر آپ کہیں کہ اس کتاب کو پکڑ لو یا میں نے کتاب خریدی حالانکہ آپ کے کہنے کا مقصد سیب یا کپڑا تھا، تو یہاں نہ تو کتاب اور سیب کے درمیان کوئی مناسبت ہے اور نہ کتاب اور کپڑے کے درمیان۔

تعلق کا مقصد:

اس طریقے سے ذہن کو ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف منتقل کرنا تعلق کا مقصد ہے، گویا کہ یہ ذہن کے لیے ایک پل کی مانند ہے جسے ذہن عبور کرتا ہے، مثال کے طور پر آپ کا کہنا کہ: میں نے شیر کو تیر اندازی کرتے ہوئے دیکھا۔ یہاں پر ذہن کے منتقل ہونے کا پل شجاعت ہے جو ذہن کو چیر پھاڑ کرنے والے درندے سے بہادر آدمی کی طرف لے جاتی ہے، اور یہ شجاعت ہی ہے جو چیر پھاڑ کرنے والے درندے اور بہادر آدمی دونوں معنوں میں ربط کا کام دے رہی ہے۔

تعلق کی اقسام:

تعلق یا تو مشابہت والا ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مثال میں بہادر آدمی شیر سے شجاعت میں مشابہ ہے کیونکہ یہ معنی دونوں میں مشترک ہے۔

یا پھر مشابہت والا نہیں ہوتا جیسے لوگوں کا کہنا ہے کہ: امیر نے شہر میں اپنی آنکھیں پھیلا دی ہیں، یعنی اپنے جاسوس پھیلا دیئے ہیں۔

ہر وہ مجاز جس کا تعلق مشابہت والا ہو، اسے استعارہ کہتے ہیں کیونکہ پہلے آپ نے تشبیہ دی، پھر مشبہ بہ والے لفظ کو ادھار لے کر مشبہ پر فٹ کر دیا۔

اور ہر وہ مجاز جس کا تعلق مشابہت والا نہ ہو، اسے مجاز مرسل کہتے ہیں، کیونکہ وہ مشابہت کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔

بغیر مشابہت والے تعلق بہت سارے ہیں کیونکہ یہ ہر قسم کی مناسبت کو شامل ہے جو دو معنوں کے درمیان ہوتی ہے اور لفظ کو ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف منتقل کرنا صحیح قرار دیتی ہے۔ جیسے کہ کلی اور جزئی کا تعلق ہے کہ بولا تو 'کل' جاتا ہے لیکن مراد 'جزء' لیا جاتا ہے، مثال کے طور پر آپ کہیں کہ: پولیس نے چور پکڑ لیا ہے۔ یہاں پر مراد یہ ہے کہ پولیس والوں میں سے کسی ایک پولیس والے نے چور کو پکڑ لیا ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ لفظ 'جزء' کا بولا جائے اور مراد 'کل' لیا جائے، جیسے کہ گزشتہ مثال میں آنکھ کا لفظ بول کر پورا انسان مراد لیا گیا تھا۔

اسی طرح سبب اور مسبب کا تعلق ہے کہ سبب بول کر مسبب مراد لیا جاتا ہے، مثال کے طور پر: ہم پر بادل برسے۔

اور کبھی مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے، جیسے: آسمان نے بہار برسائی۔

اسی طرح حال اور محل کا تعلق ہے کہ کبھی آپ 'حال' بول کر 'محل' مراد لیتے ہیں اور کبھی 'محل' بول کر 'حال' مراد لیتے ہیں۔

مجاز لغوی مفرد بھی ہوتا ہے اور مرکب بھی:

۱۔ **مجاز لغوی مفرد:** وہ مجاز لغوی ہے جو ایک لفظ میں ہو جیسے کہ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۲۔ مجاز لغوی مرکب: وہ مجاز لغوی ہے جو جملوں میں ہو، اگر اس میں تعلق مشابہت والا ہو تو اس کا نام استعارہ تمثیلیہ رکھتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام مجاز مرکب مرسل رکھتے ہیں۔

استعارہ تمثیلیہ کی مثال: ایک صورت کو دوسری صورت سے تشبیہ دینا، اور مشبہ بہا صورت پر جو چیز دلالت کر رہی ہو اسے نقل کر کے مشبہ کی صورت پر چسپاں کر دینا، جیسے آپ کا کسی معاملہ میں متردد شخص کو کہنا: میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک قدم آگے کرتے ہو اور دوسرا پیچھے کر لیتے ہو۔

مجاز مرکب مرسل کی مثال: آپ کا اس شخص سے کہنا جس نے دو بری عادتوں، مثلاً سگریٹ پینا اور داڑھی منڈوانا کو اپنے اندر جمع کیا ہوا ہو: کھجوریں بھی گھٹیا اور تول بھی نکما!

(۲) مجاز عقلی: مجاز عقلی اس وقت ہوتا ہے جب الفاظ تو اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوں لیکن نسبت مجازی ہو، جیسے آپ کا یہ قول کہ: امیر نے محل بنایا۔

تو یہاں [بنایا]، [امیر] اور [محل] کے الفاظ اپنی حقیقت میں ہی استعمال ہوئے ہیں لیکن بنانے کی نسبت امیر کی طرف مجازی ہے کیونکہ حقیقت میں تو محل مزدوروں نے بنایا ہے۔

امر:

امر کا لفظ دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے:

۱۔ فعل کو طلب کرنے کے لیے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلاةِ ﴾ [طه: ۱۳۲] اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے۔

اس امر کی جمع 'اوامر' آتی ہے۔

۲۔ کام، حالت اور معاملہ کے لیے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ ﴾ [آل عمران: ۱۵۹] اور معاملات میں ان سے مشورہ لیجئے۔

اس امر کی جمع 'امور' آتی ہے۔

یہاں (اصول فقہ میں) امر پہلے معنی میں ہے کیونکہ اس میں طلب کا معنی پایا جاتا ہے۔

اصطلاحی تعریف: تحکم کے انداز میں فعل کو اس قول کے ذریعے طلب کرنا جو اس (طلب کرنے) پر دلالت کرے۔

اکثر اصولیوں نے آمر (حکم دینے والے) میں علو اور استعلاء کی شرط نہیں لگائی اس کے لیے انہوں نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی بات سے استشہاد کیا ہے جو انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہی تھی:

أمرتك أمرًا جازمًا فعصيتني   وكان من التوفيق قتل ابن هاشم

'میں نے آپ کو بہت پختہ حکم (مشورہ) دیا تھا لیکن آپ نے میری بات نہ مانی حالانکہ ہاشم کے بیٹے کا قتل توفیق میں سے تھا۔'

اصل میں ابن ہاشم نے معاویہ رضی اللہ عنہ پر خروج کیا تھا، انہوں نے اسے پکڑ لیا لیکن پھر معاف کر دیا تو اس نے دوسری مرتبہ خروج کر دیا۔

یہ بات معلوم ہے کہ یہاں پر عمرو بن العاص کو معاویہ پر کوئی علو اور استعلاء حاصل نہ تھا۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان بھی ہے فرعون کی اس بات کی حکایت کرتے ہوئے جو اس نے اپنی قوم سے کہی تھی: ﴿ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ﴾ [الأعراف:۱۱۰] تم مجھے کس بات کا حکم (مشورہ) دیتے ہو؟

ممکن ہے کہ اس بات کا یہ جواب دیا جائے کہ اس نے ان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا اختیار دیا تو یہی ان کے لیے اعلاء بن گیا۔

امر کے لیے استعمال ہونے والے صیغے:

امر کے کچھ صیغے ہیں جو اگر کسی قرینہ صارفہ سے خالی ہوں تو طلب فعل پر دلالت کرتے ہیں، یہ صیغے چار ہیں:

۱۔ **فعل امر:** جیسے: ﴿ أَقِمِ الصَّلَاةَ ﴾ [الإسراء:۷۸] نماز قائم کرو۔

﴿ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُم ﴾ [نوح:۱۰] اپنے رب سے بخشش طلب کرو۔

﴿ يا أَيهَا النَّبي جَاهِدِ الكُفَّارَ وَالمُنَافِقِينَ ﴾ [التوبة:۷۳] اے نبی ﷺ! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے۔

۲۔ **مضارع مجزوم بلام امر:** جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيتِ الْعَتِيقِ ﴾ [الحج:۲۹] پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اللہ کے قدیم گھر کا طواف کریں۔

۳۔ **اسم فعل بمعنی امر:** جیسے اللہ رب العالمین کا یہ فرمان ہے: ﴿ يا أَيهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيكُمْ أَنفُسَكُمْ ﴾ [المائدة:۱۰۵] اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو۔

۴۔ **فعل امر کا نائب مصدر:** جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَضَرْبَ الرِّقَابِ ﴾ [محمد:٤] تو ان کی گردنیں مارو۔

امر کے صیغوں کا فائدہ دینے والے چند مزید صیغ:

امر کے اصلی صیغوں کا بیان پیچھے گزر چکا ہے۔ کچھ اور بھی ایسے صیغے ہیں جو کسی چیز کے حکم اور اس کے پیدا کرنے کی طلب پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ صیغ یہ ہیں:

۱۔ امر کے لفظ کے ساتھ وضاحت ہو، جیسے: «آمر كم، وأمرتكم، أنتم مأمورون» میں تمہیں حکم دیتا ہوں، میں نے تمہیں حکم دیا تھا، تمہیں حکم دیا گیا تھا وغیرہ۔

۲۔ کسی کام کے واجب ہونے کی صراحت کا ہونا۔

۳۔ فرض یا لکھے جانے کی وضاحت کا ہونا۔

۴۔ حق علی العباد و علی المؤمنین (بندوں اور مؤمنوں پر کام کرنا واجب ہے) کے الفاظ کا ہونا۔

۵۔ اسی طرح جن کاموں کے چھوڑنے پر مذمت بیان کی گئی ہو اور سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا ہو یا پھر اعمال کے برباد ہونے کی خبر سنائی گئی ہو۔

مذکورہ بالا بیان جمہور کی رائے ہے اور انہوں نے ان الفاظ کے امر ہونے پر اہل لغت کے اجماع سے استدلال کیا ہے۔ لہٰذا جب مالک اپنے غلام سے کہتا ہے کہ: ” «أعطني كذا» “ مجھے فلاں چیز دو، تو اس مالک کو آمر (حکم دینے والا) اور غلام کو اگر وہ یہ کام کرے تو مطیع (حکم کی پیروی کرنے والا) سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر نہ کرے تو اسے نافرمان گردانا جاتا ہے۔

اشاعرہ اور ان کی پیروکاروں کا مذہب یہ ہے کہ امر کا کوئی لفظی صیغہ ہے ہی نہیں کیونکہ ان کے نزدیک کلام لفظ کی بجائے اس معنی کو کہتے ہیں جو قائم بالنفس (دل میں موجود) ہو اور الفاظ کو تو صرف اس لیے بنایا گیا ہے تاکہ وہ دل میں موجود معنی کی تعبیر کر سکیں اور اس پر دلالت کر سکیں۔ لیکن یہ رائے کتاب وسنت کی خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ومردود ہے۔

قرآنی دلیل: ایک تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے جو اللہ رب العزت نے زکریا علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ آيتُكَ أَلاَّ تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلاثَ لَيَالٍ سَوِيا ﴾ [مريم: ۱۰] تمہارے لیے یہ نشانی مقرر کی گئی ہے کہ تم مسلسل تین راتوں تک لوگوں سے کلام نہیں کر سکو گے۔

تو یہاں زکریا علیہ السلام کے دل میں موجود معنی اور اس اشارے پر جسے قوم نے سمجھ لیا تھا، کلام کا لفظ نہیں بولا گیا۔

رہی سنت سے دلیل تو وہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے میری امت کے ان گناہوں کو معاف کر دیا جو ان کے دلوں میں موجود ہیں، جب تک وہ ان کے ساتھ کلام نہ کریں یا عمل نہ کریں۔

تو یہاں پر نبی کریم ﷺ نے دل میں موجود معنیٰ اور کلام کے درمیان فرق کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ رب العالمین نے پہلے کو تو معاف کیا ہے، دوسرے کو نہیں۔

جب مطلق امر کا صیغہ بولا جائے تو اس کا کیا حکم ہوتا ہے؟

جب امر کا صیغہ اپنی مراد پر دلالت کرنے والے تمام قرائن سے خالی ہو تو وہ وجوب کا تقاضا کرتا ہے، یہی جمہور کا قول ہے اور اسی پر دلیلیں دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ابلیس سے یہ کہنا کہ: ﴿ مَا مَنَعَكَ أَلاَّ تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ﴾ [الأعراف:١٢] جب میں نے تجھے سجدہ کرنے کا حکم دے دیا تھا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟

اسی طرح اللہ رب العالمین کا یہ فرمان کہ: ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لا يَرْكَعُونَ ﴾ [المرسلات:٤٨] جب انہیں کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو رکوع نہیں کرتے۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [النور:٦٣] تو جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نافرمانی (مخالفت) کرتے ہیں، وہ فتنے یا دردناک عذاب کے پہنچنے سے ڈریں۔

اسی طرح یہ فرمان الٰہی بھی کہ: ﴿ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ﴾ [طه:٩٣] کیا آپ نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عبرت نشان بھی کہ: ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ﴾ [الأحزاب:٣٦] جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو کسی مؤمن مرد وعورت کے لیے ان کے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فرامین ہیں۔ ان تمام دلائل سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ مامور (جس کو حکم دیا گیا ہو) کے لیے سوائے امر کو سرانجام دینے کے اور کوئی راستہ نہیں ہے جس کے ذریعے وہ وعید سے خلاصی، عذاب اور نافرمانی کی عار (ذلت) سے نجات پا سکے۔

اسی طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی امر کے ذریعے وجوب پر استدلال کرنا اس قاعدے کی ایک اور دلیل ہے اور چونکہ اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے لہٰذا یہ اجماع ہے۔

پھر اسی طرح جو غلام اپنے آقا کے حکم کو سرانجام نہ دے اہل لغت کا اس کی مذمت بیان کرنا اور اسے نافرمانی سے موصوف کرنا بھی اس قاعدے کے درست ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ کسی کی مذمت اور اسے نافرمان اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب وہ کسی واجب کو ترک کرے۔

کسی چیز کا حکم نہ صرف اسی چیز کا حکم ہے بلکہ جس پر وہ چیز موقوف ہو، اس کا بھی ہے:

جب مطلق واجب کا وجود کسی دوسری چیز پر موقوف ہو تو اس واجب کا حکم اس دوسری چیز کو بھی شامل ہوتا ہے جس پر اس واجب کا وجود موقوف ہو، جیسے: وضو، دراصل نماز کا حکم وضو کے حکم کو بھی اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے اور یہی اصولیوں کے اس قول کا مطلب ہے کہ: "کسی چیز کا حکم نہ صرف اسی چیز کا حکم ہوتا ہے بلکہ اس چیز کا بھی حکم ہوتا ہے جس کے بغیر یہ چیز پوری نہیں ہو سکتی"، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری چیز کا ذکر چونکہ ضمنی طور پر اس میں آ چکا ہے لہٰذا بغیر کسی مستقل دلیل کے وہ چیز واجب ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ اس دوسری چیز کے لیے بھی الگ سے دلائل موجود ہوتے ہیں، باوجود اس کے کہ واجب کے لیے جو خاص حکم ہے وہ اس کے بھی وجوب کا تقاضا کرتا ہے، جس پر یہ واجب موقوف ہے۔

یہ ساری بحث واجب مطلق (وہ امر جو ہر قسم کی قید سے خالی ہو) کے بارے میں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ نماز کا واجب ہونا ہر قسم کی قید سے ہٹ کر ہے لیکن اس کا حکم درحقیقت اس چیز کے بھی واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے جس کے بغیر یہ حکم پورا نہیں کیا جا سکتا، اور وہ دوسری چیز وضو ہے۔

باقی رہا مقید واجب تو وہ اس طرح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زکاۃ کا وجوب نصاب کے مالک بننے سے مقید ہے، لیکن یہاں پر زکاۃ ادا کرنے کا حکم نصاب کے حصول کا تقاضا نہیں کرتا کہ بندہ مال حاصل کر کے اس میں سے زکاۃ نکالے، کیونکہ یہ وجوب کو پورا کرنے کے لیے ہے نہ کہ واجب کو۔ اسی لیے اصولی کہتے ہیں کہ جس چیز کے بغیر واجب مکمل نہ ہو، وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے اور جس چیز کے بغیر وجوب مکمل نہ ہو، وہ چیز واجب نہیں ہوتی۔ تو جو نماز ہے اس کا وجوب تو ثابت ہے لیکن زکاۃ اس وقت تک واجب نہیں ہوتی جب تک نصاب حاصل نہ ہو جائے۔

امر کے صیغوں کا اپنے اصلی معنوں کے علاوہ دوسرے معانی میں استعمال:

جب قرینہ پایا جائے گا تو امر کا صیغہ اپنے اصلی معنی کی بجائے اسی معنی میں استعمال ہو گا جس پر قرینہ دلالت کرے گا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ **کسی چیز کے مباح ہونے کے بارے میں بتانے کے لیے:** جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان عالیشان ہے: ﴿ كُلُوا وَاشْرَبُوا ﴾ [البقرة: ٦٠] کھاؤ اور پیو۔

۲۔ **دھمکی کے لیے:** جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذیشان ہے: ﴿ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ﴾ [فصلت: ٤٠] جو کرنا ہے، کر لو۔

۳۔ **احسان جتلانے کے لیے:** جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے: ﴿ كُلُوْا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٥٤] جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے، اس میں سے کھاؤ۔

۴۔ **عزت دینے کے لیے:** جیسے فرمان رب العالمین ہے: ﴿ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ﴾ [الحجر: ٤٦] اس جنت میں سلامتی کے ساتھ، امن والے بن کر داخل ہو جاؤ۔

۵۔ **عاجز کرنے کے لیے:** جیسے فرمان ربِ کائنات ہے: ﴿ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ﴾ [البقرة: ٢٣] (جاؤ) اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ۔

۶۔ **برابری ظاہر کرنے کے لیے:** جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان عالی مقام ہے: ﴿ فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا ﴾ [الطور: ١٦] صبر کرو یا نہ کرو (تمہارے لیے برابر ہے)۔

۷۔ **حقارت ظاہر کرنے کے لیے:** جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ **أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ** ﴾ **[یونس: ۸۰]** جو ڈال سکتے ہو، ڈال لو۔

۸۔ **مشورہ کے لیے:** جیسے اللہ رب العزت کا یہ فرمان ہے: ﴿ **فَانظُرْ مَاذَا تَرَى** ﴾ **[الصافات: ۱۰۲]** غور کرو (اور بتاؤ) تمہارا کیا خیال (مشورہ) ہے؟

۹۔ **عبرت دلانے کے لیے:** جیسے اللہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: ﴿ **انظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ** ﴾ **[الأنعام: ۹۹]** اس کے پھل کی طرف تو دیکھو جب وہ پھلدار ہوتا ہے۔

۱۰۔ **دعا کے لیے:** جیسے آپ کہیں کہ: ﴿ **رَبِّ اغْفِرْ لِي** ﴾ اے میرے رب! مجھے بخش دے۔

۱۱۔ **درخواست کے لیے:** جیسے آپ اپنے ساتھی سے کہیں کہ: «**ناولني القلم**» مجھے قلم تو پکڑا دیجئے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

جس کام کا حکم دیا گیا ہو اسے بار بار کیا جائے گا یا نہیں؟

اس مسئلے کی تین صورتیں ہیں، کیونکہ حکم یا تو ایک مرتبہ کرنے کے ساتھ مقید ہوگا یا بار بار دہرانے کے ساتھ یا پھر قید سے ہی خالی ہوگا۔

پہلی صورت: حکم کو اسی چیز پر محمول کیا جائے گا جس کی قید لگائی گئی ہوگی۔ قید یا تو صفت کے ذریعے ہوگی یا شرط کے ذریعے۔ جو قید صفت کے ذریعے ہوگی، اس کی مثال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ **وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيدِيهُمَا** ﴾ **[المائدة: ۳۸]** چوری کرنے والے مرد و عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔

تو جب بھی چوری والی صفت پائی جائے گی، ہاتھ کاٹنا واجب ہو جائے گا، جب تک کہ چوری کا تکرار ہاتھ کاٹنے سے پہلے نہ ہو۔ اور جو قید شرط کے ساتھ ہوگی، اس کی مثال نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: «**إذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما يقول...**» إلخ' جب تم مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنو تو ویسے ہی کہو جیسے وہ کہہ رہا ہو۔۔۔

دوسری صورت: حکم کو اسی چیز پر محمول کیا جائے جس کی قید لگائی گئی ہو گی، جیسے پہلی صورت میں تھا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عالیشان ہے: ﴿ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيهِ سَبِيلاً ﴾ [آل عمران: ۹۷] لوگوں میں سے جو بھی بیت اللہ کے حج کے لیے راستے کی طاقت رکھے، اس پر اللہ رب العالمین کا یہ حق ہے کہ وہ حج ضرور کرے۔

تو جب اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا ہر سال حج کرنا واجب ہے؟ تو آپ ﷺ نے جو جواب دیا، وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک ہی مرتبہ کرنا فرض ہے۔ لہٰذا اس قید کی وجہ سے آیت میں حکم کو ایک مرتبہ کرنے پر محمول کیا جائے گا۔

تیسری صورت: یہ ہر قسم کی قید سے خالی حکم ہوتا ہے، اسی لیے اکثر اصولیوں کا موقف یہی ہے کہ اس قسم کے حکم کو صرف ایک مرتبہ کرنا پڑے گا، دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ حکم صرف ماہیت (حالت، کیفیت) کو پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور اسے ایک مرتبہ بجالانا ہی کافی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر خاوند اپنے وکیل کو کہے کہ میری بیوی کو طلاق کا نوٹس بھجوادو، تو وکیل صاحب صرف ایک طلاق کا نوٹس ہی بھجوا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر مالک اپنے غلام کو گھر میں داخل ہونے کا حکم دے تو غلام کے ایک مرتبہ داخل ہونے سے ہی حکم پورا ہو جائے گا، اس حکم کو نہ دہرانے پر غلام کی ڈانٹ ڈپٹ درست نہیں ہو گی۔

امر مطلق کام کے فوری سرانجام دیئے جانے کا تقاضا کرتا ہے:

جب امر کا صیغہ کام کو جلدی یا دیر سے کرنے کے الفاظ سے خالی ہو تو دراصل وہ امر کام کے جتنا جلد ممکن ہو، سرانجام دیئے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس پر بہت ساری دلیلیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ رب العالمین کا یہ فرمان: ﴿ وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] اپنے رب کی مغفرت کی طرف بھاگ کر آؤ۔

اسی طرح یہ فرمان الٰہی: ﴿ سَابِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ [الحديد: ۲۱] اپنے رب کی مغفرت کی طرف ایک دوسرے سے سبقت لے جاؤ۔

اور یہ فرمان عالی مقام بھی: ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيرَاتِ ﴾ [البقرة:١٤٨] نیکی کے کاموں میں جلدی کرو۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا جلدی کرنے والوں کی تعریف کرنا بھی اس بات کی ایک دلیل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ أُوْلَئِكَ يسَارِعُونَ فِي الْخَيرَاتِ ﴾ [المؤمنون:٦١] یہی لوگ ہیں جو نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔

ان نصوص سے دلیل اس لیے پکڑی گئی ہے کیونکہ سبقت لے جانا، مقابلہ کرنا اور جلدی کرنا کام کے فوری سرانجام دینے پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح اللہ رب العزت کا ابلیس کی مذمت اس وجہ سے کرنا کہ اس نے سجدہ کرنے کے حکم پر عمل کرنے میں جلدی نہیں کی تھی، (اس قاعدے کے درست ہونے کی ایک اور دلیل ہے) اللہ تعالیٰ کا فرمان ذیشان ہے: ﴿ مَا مَنَعَكَ أَلاَّ تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ﴾ [الأعراف:١٢] تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جبکہ میں تجھے اس کا حکم دے چکا تھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان گرامی میں سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا: ﴿ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلائِكَةِ اسْجُدُوا لآدَمَ فَسَجَدُوا إِلاَّ إِبْلِيسَ ﴾ [البقرة:٣٤] اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے کیا سوائے ابلیس کے۔

تو اگر کام فوری سرانجام دینا ضروری نہ ہوتا تو شیطان بھی مذمت کا مستحق نہ ٹھہرتا۔

لغت بھی زیر بحث قاعدے کے درست ہونے پر دلالت کرتی ہے، وہ اس طرح کہ اگر مالک اپنے غلام کو کسی کام کے کرنے کا حکم دے اور غلام اس کی تعمیل نہ کرے، جس پر مالک اسے ڈانٹے تو اگر اس پر غلام یہ عذر پیش کرے کہ حکم مؤخر ہے، تو اس غلام کا یہ عذر قابل قبول نہ ہوگا۔

رہی بات تاخیر پر اصرار کرنے والوں کے دلائل کی تو ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حج فرض ہو جانے کے باوجود اسے دس(١٠) ہجری میں ادا کیا۔ لیکن ان لوگوں کی دلیل اس لیے باطل اور مردود ہے کہ ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حج کو چند اغراض کے پیش نظر مؤخر کیا ہو، مثلاً مشرک بیت اللہ جو خلاف شریعت کام کرتے تھے، ان کو دیکھنے سے بچنے کے لیے۔ تو جب

نو (۹) ہجری میں نبی کریم ﷺ کے منادی نے مشرکوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی برأت کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی انہیں بیت اللہ کے قریب آنے سے بھی روک دیا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مکہ کو شرک کی گندگی اور پلیدی سے پاک کر دیا، تب اللہ کے نبی ﷺ نے حج کیا۔

شریعت کے احکامات کا مکلف کون ہے اور کون نہیں ہے:

لوگوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ ایک تو وہ لوگ جن کا ادراک مکمل نہیں ہوتا، خواہ نابالغ ہونے کی بناء پر جیسے بچے ہیں، یا عقل کے نہ ہونے کی وجہ سے جیسے پاگل ہیں، یا عقل پر پردہ پڑا ہونے کی بناء پر جیسے نشہ میں چور شخص، یا ذہن کے منتشر ہونیکی وجہ سے جیسے بھلکڑ۔

۲۔ جن کی عقل مکمل ہو چکی ہوتی ہے اور وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو عاقل، بالغ اور شق نمبر ایک میں بیان کردہ تمام چیزوں سے سلامت ہوتے ہیں۔

تو جو پہلی قسم کے لوگ ہیں، وہ کام کرنے اور ترک کرنے یا بالفاظ دیگر شریعت کے مکلف نہیں ہوتے۔ اس بات کی درستی پر عقلی اور نقلی دلیلیں موجود ہیں۔

۱۔ عقل کی رُو سے تو وہ لوگ اس لیے پابند نہیں کیے جاسکتے کہ حکم تو چاہتا ہے کہ اس کو بجا لایا جائے اور جو بندہ حکم کا ہی ادراک نہ کر سکے، وہ اس حکم کو سرانجام نہیں دے سکتا۔

۲۔ باقی رہی بات نقلی دلیل کی تو وہ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث مبارکہ ہے: «**رفع القلم عن ثلاث...**» **الحدیث**۔ تین قسم کے بندوں سے قلم کو اُٹھالیا گیا ہے یعنی وہ مرفوع القلم ہیں۔ یہاں پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ پھر تو مرفوع القلم کو چٹی بھی نہیں بھرنی پڑے گی۔ کیونکہ یہ تو دوسرے کا حق ہے اور اس میں عاقل اور غیر عاقل بلکہ جانور تک شامل ہیں کیونکہ اگر وہ بھی کسی کا نقصان کر دیں تو ان کے مالکوں کو تاوان بھرنا پڑے گا۔

دوسری قسم کے لوگ مسلمان بھی ہوسکتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اور شریعت کا خطاب یا تو اصل کے متعلق ہوتا ہے، مثلاً عقائد وغیرہ یا پھر فرع کے بارے میں ہوتا ہے، مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ۔

۱۔ اصل کے بارے میں جو خطاب ہوتا ہے، اس میں باتفاق علماء سبھی شامل ہوتے ہیں۔

۲۔ اور جو حکم فرع کے بارے میں ہوتا ہے، اس میں اختلاف ہے۔ صحیح قول کے مطابق کفار اس خطاب میں بھی شامل ہیں۔ اس بات کی دلائل میں سے ایک دلیل تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کفار کے بارے میں یہ فرمان ہے کہ: ﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ (٤٢) قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ (٤٣) وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ (٤٤) وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (٤٥) وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴾ [المدثر:٤٢_٤٦]

ترجمہ: تمہیں کس چیز نے جہنم میں داخل کر دیا ہے؟ وہ (کفار) کہیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہ تھے، مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے بلکہ باطل کے ساتھ مشغول ہونے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغول ہو جایا کرتے تھے اور آخرت کے دن کو جھٹلاتے تھے۔

تو یہاں پر کفار نے اپنے عذاب دیئے جانے کے اسباب میں ان چیزوں کو پہلے ذکر کیا ہے جو فروعات میں سے ہیں جیسے نماز اور زکاۃ ادا نہ کرنا اور بحث مباحثہ کرنا جس سے انہیں روکا گیا تھا، اور انہوں نے اپنے سب سے بڑے قصور یعنی قیامت کے دن کو جھٹلانے کے ذکر اکتفا نہیں کیا۔

اس زیر بحث مسئلہ کی دوسری دلیل نبی ﷺ کا یہودیوں کو رجم کرنا ہے۔

اس کی تیسری دلیل اللہ رب العالمین کا یہ فرمان ہے: ﴿ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ ﴾ [النحل:٨٨]

ترجمہ: وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، ہم ان کے لیے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے۔

جس طرح مؤمن کو ایمان لانے، جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے ان کی بجا آوری، اور جن سے روکا گیا ان سے رکنے پر ثواب دیا جاتا ہے، اسی طرح کافر کی بھی توحید چھوڑنے، منہیات کے ارتکاب اور اوامر کی بجا آوری نہ کرنے پر گرفت کی جائے گی۔

نہی:

تعریف: لغت میں نہی کے معنی روکنے کے ہیں، اسی وجہ سے عقل کو "نہیۃ" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ آدمی کو ان چیزوں سے روکتی ہے جو اس کی شان کے لائق نہ ہوں۔

اصطلاح میں نہی کی تعریف کچھ یوں کی جاتی ہے کہ: حاکمانہ انداز میں کسی (شخص) سے کسی کام سے رکنے کا مطالبہ کرنا، کف، ذر وغیرہ جیسے الفاظ کے استعمال کے علاوہ۔

اس کی مثال رب کائنات کے یہ دو فرامین گرامی ہیں:

﴿ لا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَينَكُم بِالْبَاطِلِ ﴾ [النساء: ٢٩]

ترجمہ: اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔

﴿ يا أَيهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ [الأنفال: ٢٧]

ترجمہ: اے ایمان والو! نہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے خیانت کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو اس حال میں کہ تم (اس کی سزا) جانتے ہو۔

نہی کے صیغ:

مضارع کا ہر وہ صیغہ جو لائے نہی کی وجہ سے مجزوم ہو۔ یاد رہے کہ نہی کے صیغوں میں 'کف'، 'ذر' 'یا 'دع' وغیرہ شامل نہیں ہیں اگرچہ ان میں بھی فعل سے رکنے کا مطالبہ پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر: ﴿ وَذَرُوا ظَاهِرَ الإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ﴾ [الأنعام: ١٢٠] ظاہری اور باطنی (ہر قسم کے) گناہ چھوڑ دو۔﴿ وَدَعْ أَذَاهُمْ ﴾ [الأحزاب: ٤٨] ان کی تکلیفوں کو چھوڑ دیجئے ﴿ فَخَلُّوا سَبِيلَهُم ﴾ [التوبة: ٥] ان کا راستہ چھوڑ دو۔

یہ الفاظ فعل سے رکنے کا مطالبہ اپنے اندر رکھنے کے باوجود نہی سے اس لیے خارج ہیں کہ یہ امر کے صیغے ہیں۔

نہی کس چیز (حکم) کا تقاضا کرتی ہے؟

نہی حقیقتاً کسی چیز کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ فرمان رسول ﷺ: «وما نهيتكم عنه فاجتنبوه» جس چیز سے میں تمہیں روک دوں، اس سے رک جاؤ۔

ان صیغوں کا بیان جو "نہی" کا فائدہ دیتے ہیں:

درج ذیل صیغ حرمت کے فائدہ دینے میں نہی کے ساتھ شامل ہیں:

۱۔ تحریم کے لفظ سے وضاحت ۔

۲۔ کام کرنے سے منع، روک اور ڈانٹ کا ہونا۔

۳۔ کام کرنے پر فاعل کی مذمت کرنا۔

۴۔ کام کرنے پر کفارے کا واجب ہونا۔

۵۔ ان الفاظ کا ہونا کہ ان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں تھا۔

۶۔ کام کرنے پر حد کا واجب ہونا۔

۷۔ لایحل کے الفاظ کا ہونا۔

۸۔ کام کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ فساد ہے یا شیطان کی تزئین اور اس کے کاموں میں سے ہے۔

۹۔ کام کے متعلق یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے بندوں کے لیے پسند نہیں کرتے۔

۱۰۔ ان الفاظ کا ہونا کہ کام کرنے والے کو اللہ رب العزت (گناہوں سے) پاک نہیں کریں گے، نہ ان سے کلام کریں گے اور نہ ہی اس کی طرف دیکھیں گے۔

اسی طرح چند اور صیغے بھی ہیں۔

نہی کے صیغے کا حرمت کا فائدہ دیئے بغیر کلام میں وارد ہونا:

کبھی نہی کا صیغہ کلام میں آتا ہے لیکن کام کے حرام ہونے کا فائدہ نہیں دیتا۔ مثلاً

۱۔ ناپسندیدگی کے معنوں میں نہی کا صیغہ آتا ہے جیسے مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پینے کی نہی۔

۲۔ جب چھوٹا بڑے کے لیے نہی کا صیغہ استعمال کرے تو وہاں نہی کا صیغہ دعا کے لیے ہوتا ہے، جیسے: ﴿ رَبَّنَا لا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ﴾ [البقرة:٢٨٦] اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہماری پکڑ نہ کرنا۔

۳۔ کبھی یہ رہنمائی کے لیے بھی وارد ہوتا ہے، جیسے اللہ رب العالمین کا یہ فرمان عالی شان ہے: ﴿ لا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ﴾ [المائدة:١٠١] کچھ چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری محسوس ہوں۔

اسی طرح نہی ان تمام معنوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے جن کے لیے امر استعمال ہوتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امر فعل طلب کرنے کے لیے ہوتا ہے اور نہی فعل سے رکنے کو طلب کرتا ہے۔

نہی کی حالتیں:

نہی کی درج ذیل چار حالتیں ہیں:

۱۔ یہ کہ نہی صرف ایک چیز کی ہو، جیسے زنا کی نہی۔ اور یہ حالت اکثر ہوتی ہے۔

۲۔ یہ کہ متعدد کو جمع کرنے کی نہی ہو۔ جس کام سے روکا گیا ہو وہ اگر بندہ علیحدہ علیحدہ کرے تو اس کے لیے جائز ہو، جیسے ایک نکاح میں دو بہنوں کو، خالہ اور اس کی بھانجی کو یا پھوپھی اور اس کی بھتیجی کو جمع کرنا۔

۳۔ یہ کہ جمع شدہ چیزوں کو علیحدہ کرنے کی نہی ہو، چاہے وہ دو ہوں یا زیادہ۔ جیسے ایک جوتی اتار کر اور دوسری پہن کر چلنا، لہٰذا جس کو روکا گیا ہے اسے چاہیے کہ یا تو دونوں جوتے پہنے یا دونوں ہی اتار دے۔

۴۔ یہ کہ متعدد چیزوں کی نہی ہو، چاہے ان کو اکٹھا کر لیا جائے یا علیحدہ ہی رکھا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذیشان ہے: ﴿ وَلا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴾ [الإنسان:٢٤] اور آپ ﷺ ان میں سے نہ گناہگار کی بات مانیے اور نہ ہی ناشکرے (کافر) کی۔

تو نہ تو ان دونوں کی اکٹھے اطاعت جائز ہے اور نہ ہی علیحدہ علیحدہ۔

اور اس نہی کی مختلف حالتوں کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے: " **لا تأكلِ السمكَ وتشربِ اللبنَ** " دونوں فعلوں پر اگر جزم ہو تو چوتھی حالت کی مثال ہو گی۔ یعنی نہ تو مچھلی اور دودھ کو اکٹھا کر کے کھانا پینا جائز ہے اور نہ ہی علیحدہ علیحدہ۔ اور اگر دوسرے فعل کو نصب دی جائے تو یہ دوسری حالت کی مثال بن جائے گی " **لا تأكلِ السمك وتشربَ اللبن** " یعنی کہ آپ مچھلی اور دودھ کو اکٹھا استعمال نہیں کر سکتے، البتہ علیحدہ علیحدہ استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اگر دوسرے فعل کو رفع دے دیا جائے تو یہ پہلی حالت کی مثال بن جائے گی " **لا تأكلِ السمك وتشربُ اللبن** " یعنی صرف مچھلی کھانے کی ممانعت ہو گی۔

جس چیز سے روکا گیا ہو، نہی اس کے فاسد ہونے کا تقاضا کرتی ہے:

جن چیزوں سے روکا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

①۔ پہلی وہ قسم ہے کہ اس میں جن چیزوں سے روکا جاتا ہے ان کا کبھی بھی مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان عبرت نشان ہے: " ﴿ **وَلا تَقْرَبُوا الزِّنَى** ﴾ **[الإسراء: ٣٢]** " زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اسی طرح یہ فرمان عالی مقام: " ﴿ **وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلا تُشْرِكُوا بِهِ شَيئًا** ﴾ **[النساء: ٣٦]** " اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔

یہ وہ نہی ہے جو اپنی ذات کی وجہ ممنوع ہے، یعنی فی نفسہٖ قباحت ہونے کی وجہ سے منع کیا گیا ہے۔ تو یہ قطعی طور پر حرام اور لازمی طور پر باطل ہے۔ اور اس پر جو بھی مترتب ہو گا وہ بھی باطل ہو گا، جیسے ولد الزنا کہ اس کو اس کے باپ سے لاحق نہیں کیا جائے گا، اسی طرح مشرک کے اعمال کہ ان کا اس کا کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

②۔ دوسری قسم وہ ہے کہ جس سے ایک اعتبار سے تو روکا گیا ہے اور دوسرے اعتبار سے اس کا حکم بھی دیا گیا ہوتا ہے۔ اس قسم کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جس سے کسی صفت کی وجہ سے روکا گیا ہو۔

۲۔ کسی ایسی چیز کی وجہ سے روکا گیا ہو جو اس کے ساتھ لازم ہو۔

۳۔ کسی خارجی امر کی وجہ سے جس سے روکا گیا ہو۔

① جس سے کسی صفت کی وجہ سے روکا گیا ہو:

۱۔ **عبادات میں:** حائضہ اور نشہ باز کا نماز پڑھنے سے ممانعت۔

۲۔ **معاملات میں:** بیع ملاقیح سے ممانعت مبیع کے مجہول ہونیکی وجہ سے۔

② کسی ایسی چیز کی وجہ سے روکا گیا ہو جو اس کے ساتھ لازم ہو:

۱۔ **عبادات میں:** عید کے دن روزے رکھنے کی ممانعت کیونکہ اس طرح اس دن میں اللہ تعالیٰ کی مہمانی سے اعراض لازم آتا ہے۔

۲۔ **معاملات میں:** کسی مسلمان غلام کو کسی کافر کے ہاتھ بیچنا جب آزادی لازم نہ آئے، کیونکہ اس طرح کافر کی مسلمان مبیع پر ولایت ثابت ہوتی ہے۔

③ کسی خارجی امر کی وجہ سے جس سے روکا گیا ہو:

۱۔ **عبادات میں:** غصب شدہ پانی سے وضو کرنا یا غصب شدہ زمین پر نماز پڑھنا۔

یہاں پر ممانعت کی وجہ ایک خارجی امر ہے، نہ کہ وضو کرنے کی ممانعت ہی ہے بلکہ یہ ممانعت اس وجہ سے ہے کہ کسی غیر کا حق اس کی اجازت کے بغیر استعمال کیا گیا ہے، لہٰذا یوں بغیر اجازت وضو کر کے پانی ختم کرنا یا اسے ویسے ہی گرا دینا برابر ہے۔

جس چیز سے اس کی ذات کی وجہ سے منع کیا گیا ہو اور جسے کسی خارجی امر کی وجہ سے منع کیا گیا ہو، ان کے درمیان فرق کو واضح طور پر دیکھنے کے لیے نجس پانی اور غصب شدہ پانی پر غور فرمالیں۔

۲۔ **معاملات میں:** جمعہ کی نماز کے لیے اذان کے بعد خرید وفروخت کی ممانعت۔

اس کی ممانعت کی وجہ ایک خارجی امر ہے کیونکہ تجارت کی تمام شروط تو اس میں پوری ہیں لیکن نماز کے فوت ہونے کے اندیشے کی بناء پر اس وقت تجارت ممنوع ہے۔ اگرچہ بسا اوقات نماز کے فوت ہونے کے اور بھی مختلف اسباب ہوتے ہیں۔

جمہور کا کہنا ہے کہ اس صورت میں نہی تجارت کے فساد کا تقاضا نہیں کرتی کیونکہ جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ ایسی تجارت ہے جو تمام مبطلات (باطل کرنے والی چیزوں) سے خالی ہے، لہٰذا اس میں ممانعت اسی خارجی امر کی وجہ سے ہے۔ اس بیع کے صحیح ہونے کی جہت اس کی ممانعت والی جہت سے واضح ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نہی فساد کا تقاضا کرتی ہے، کیونکہ نہی سزا کا تقاضا کرتی ہے اور صحت (یعنی بیع کا صحیح ہونا) ثواب کا تقاضا کرتی ہے۔ تو ایک ہی چیز کے سبب ثواب اور عقاب بیک وقت نہیں ہوتے۔

اس بات کے بہت سے دلائل موجود ہیں کہ نہی فساد کا تقاضا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک ہے جو صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ: «**من عمل عملاً ليس عليه أمرنا فهو رد**» جس نے کوئی ایسا عمل کیا، جس پر ہمارا حکم موجود نہیں تھا تو وہ عمل رد ہے یعنی مردود ہے۔ اور جو کام فاعل پر رد کر دیا گویا کہ وہ عدم سے وجود پذیر ہی نہیں ہوتا۔ اگر عبادت کی طرف رد کرنے کی نسبت کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس کا کوئی ثواب نہیں ہے۔ اور جب اس رد کرنے کی نسبت معاملات کی طرف کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ معاملہ فاسد ہے اور نافذ نہیں ہو سکتا۔

ایک اور دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو اچھی کھجوریں لوٹانے کا حکم دینا اور بتانا کہ یہ واضح سود ہے جب انہوں نے دو صاع گھٹیا کھجوریں دے کر ایک صاع اچھی کھجوریں خریدی تھیں۔

تیسری دلیل زیر بحث قاعدے کے صحیح ہونے کی یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی نہی کو فساد کا موجب جانتے تھے، جیسا کہ انہوں نے سودی کاروبار کے فاسد ہونے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

فرمان سے استدلال کیا تھا کہ: ” «لا تبيعوا الذهب بالذهب إلا مثلاً بمثل» “ تم سونے کو سونے کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر۔

اور مُحرم (احرام باندھے ہوئے) شخص کے نکاح کے فاسد ہونے پر انہوں نے نبی کریم ﷺ کی نہی سے استدلال کیا تھا۔

خبر کے لفظ کے ذریعے امر اور نہی کا بیان:

خبر کے لفظ کے ذریعے امر اور نہی احکام میں طلب کے لفظ کے ذریعے امر اور نہی کی طرح ہوتے ہیں۔ دونوں قسموں کی مثالیں آپ کے حضور پیش کی جارہی ہیں:

① **خبر کے لفظ کے ذریعے امر کی مثال:** اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان عالی مقام ہے:

﴿ **وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوءٍ** ﴾ **[البقرة:٢٢٨]** اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ تین حیض تک انتظار کریں۔ (یعنی عدت گزاریں)

اسی طرح اللہ رب العالمین کا یہ فرمان عالی شان ہے: ﴿ **وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ** ﴾ **[البقرة:٢٣٣]** مائیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں۔

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان مبارک بھی اسی قاعدہ کی مثال ہے: **«من مات وعليه صيام صام عنه وليه»** جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس کے ذمے کچھ روزے رکھنے باقی تھے، تو اس کی طرف سے اس کا ولی (وارث) روزے رکھے۔

② **خبر کے لفظ کے ذریعے نہی کی مثال:** اللہ رب العزت کا یہ فرمان ذیشان ہے: ﴿ **فَلا رَفَثَ وَلا فُسُوقَ وَلا جِدَالَ فِي الْحَجِّ** ﴾ **[البقرة:١٩٧]** تو حج کے دنوں میں نہ تو اپنی عورتوں کی مائل ہونا ہے، نہ گناہ کرنا ہے اور نہ ہی جھگڑا کرنا ہے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان عالی ہے: **«لا ضرر ولا ضرار»** نہ نقصان دینا ہے اور نہ نقصان اُٹھانا ہے۔

اسی کی ایک مثال نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا وہ فرمان مبارک بھی ہے جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے عمرو بن حزم کی خط میں لکھ کر بھیجا تھا کہ: «**وأن لا يمس القرآن إلا طاهر**» اور یہ کہ قرآن مجید کو پاک صاف آدمی کے علاوہ کوئی نہ چھوئے۔

عــام

تعریف: لغت میں عام شامل کو کہتے ہیں۔ اور عموم مطلق طور پر ایک چیز کے دوسری چیز کو شامل ہونے کا نام ہے۔

اصطلاح میں اس لفظ کو عام کہتے ہیں جو اپنے اندران تمام چیزوں کو سمولے جن کا اس عام کے اندر بغیر حصر کے ایک ہی وضع اور ایک ہی مرتبہ میں سمویا جانا صحیح ہو۔

تو ہماری اس بات «**ایک ہی مرتبہ**» سے اثبات کے سیاق میں 'رجل' جیسے الفاظ نکل گئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ لفظ ان چیزوں کو اپنے اندر سمولینے والا ہے جو اس کے اندر شامل ہوجانے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن یہ شمولیت بدلیت کے اعتبار سے ہوتی ہے نہ کہ ایک ہی مرتبہ۔

اسی طرح ہماری اس بات « **ایک ہی وضع** » سے مشترک المعنی قسم کے الفاظ نکل گئے ہیں۔ مثال کے طور پر «**القرء** ، **العين**» ان میں سے ہر ایک دو یا دو سے زیادہ وضع کے لیے ہے۔

اور ہماری اس بات « **بغیر حصر کے** » سے اسماء الاعداد نکل گئے ہیں، جیسے کہ دس اور سو ہے۔

یہ آخری بات ان لوگوں کے نزدیک ہے جو اعداد کو عام کے صیغوں میں شمار نہیں کرتے۔

عــام کے صیغے

عام پر دلالت کرنے والے چند الفاظ ہیں جن کو عموم کے صیغ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان میں چند حسبِ ذیل ہیں:

١۔ **کل**۔ جیسا کہ اللہ رب العالمین کا فرمان ہے: " ﴿ **كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ** ﴾ **[الأنبياء: ٣٥]** " ہر جان موت کو چکھنے والی ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان: " ﴿

كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلائِكَتِهِ ﴾ [البقرة:٢٨٥] ” (رسولوں اور مؤمنوں میں سے) ہر ایک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر ایمان لایا ہے۔

۲۔ **جمیع**۔جیسا کہ: ” **جاء القوم جميعهم** “ساری کی ساری قوم آئی۔

۳۔ **جمع** کا وہ صیغہ جو معرف باللام ہو لیکن عہد (ذہنی یا خارجی) کے لیے نہ ہو۔ جیسا کہ: ” ﴿ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴾ [المؤمنون:١] “ یقیناً مؤمن کامیاب ہوگئے۔

اسی طرح جمع کا وہ صیغہ جو اضافت کی وجہ سے معرفہ بن جائے۔ جیسا کہ: ” ﴿ يوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلادِكُمْ ﴾ [النساء:١١] “ اللہ رب العزت تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں۔

۴۔ وہ **مفرد لفظ** جو معرف باللام ہو لیکن عہد (ذہنی یا خارجی) کے لیے نہ ہو۔ جیسا کہ: ” ﴿ وَالْعَصْرِ (١) إنَّ الإنسَانَ لَفِي خُسْرٍ (٢) إلاَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ [العصر:١ــ٣] “زمانے کی قسم(۱)بیشک (بالیقین) انسان سر تا سر نقصان میں ہے(۲)سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور (جنہوں نے) آپس میں حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی(۳)

اسی طرح وہ مفرد لفظ جو اضافت کی وجہ سے معرفہ بن گیا ہو۔ جیسا کہ: ” ﴿ وَإن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لا تُحْصُوهَا ﴾ [النحل:١٨] “اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے۔

۵۔ **تثنیہ** کا وہ صیغہ جو معرف باللام ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ” «إذا التقى المسلمان بسيفيهما...» “ جب دو مسلمان تلواریں لے کر ملاقات کریں۔۔۔الخ

تو یہاں پر ” المسلمان “ تمام مسلمانوں کو شامل ہے۔

۶۔ **’ما‘**۔ یہ غیر عاقل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بطور موصولہ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ” ﴿ مَا عِندَكُمْ ينفَدُ وَمَا عِندَ اللَّهِ بَاقٍ ﴾ [النحل:٩٦] “ جو کچھ تمہارے پاس موجود ہے، وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔

بطور شرطیہ اس کی مثال اللہ رب العالمین کا یہ فرمان ہے: " ﴿ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيرٍ يعْلَمْهُ اللَّهُ ﴾ [البقرة:١٩٧] " تم جو بھی بھلائی کا کام کروگے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے جان لیں گے۔

۷۔ 'من'۔ یہ عاقل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ موصولہ کے طور پر اس کی مثال یہ فرمان الٰہی ہے: " ﴿ وَلا تُؤْمِنُوا إلاَّ لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ ﴾ [آل عمران:٧٣] " تم صرف اسی کی بات مانو جو تمہارے دین کی پیروی کرتا ہے۔

بطور شرطیہ اس کی مثال اللہ رب العزت کا یہ فرمان ہے: " ﴿ فَمَن يعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيرًا يرَهُ ﴾ [الزلزلة:٧] "تو جو کوئی ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا، اسے دیکھ لے گا۔

۸۔ مَتٰی۔ مبہم زمانہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بطور شرطیہ اس کی مثال: " «متى زرتني أكرمك» " جب بھی آپ مجھے ملنے آئیں گے، میں آپ کی عزت وتوقیر کروں گا۔

۹۔ اَیْنَ۔ مبہم جگہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بطور شرطیہ اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: " ﴿ أَينَمَا تَكُونُوا يدْرِككُّمُ الْمَوْتُ ﴾ [النساء:٧٨] " تم جہاں بھی ہوں گے، موت تمہیں تلاش پالے گی۔

۱۰۔ نفی کے سیاق میں نکرہ۔ یہ عموم میں نص اور ظاہر ہوتا ہے۔

نکرہ کا عموم میں نص اور ظاہر ہونا:

آنے والے حالات میں نفی کے سیاق میں نکرہ عموم میں نص صریح ہوتا ہے:

۱۔ جب نکرہ لائے نفی جنس کا اسم ہو۔ جیسے: " لا إله إلا الله " اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں ہے۔

۲۔ جب نکرہ سے پہلے 'مِنْ' کا اضافہ کیا جائے، اور یہ زیادتی تین جگہوں پر ہوتی ہے:

۱۔ فاعل سے پہلے۔ مثلاً: ﴿ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يتَذَكَّرُونَ ﴾ [القصص:٤٦] تاکہ آپ ﷺ ایسی قوم کو ڈرائیں جن کے پاس اس سے پہلے کوئی بھی ڈرانے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

۲۔ مفعول سے پہلے۔ مثلاً: ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ہم نے آپ ﷺ سے قبل کوئی رسول نہیں بھیجا۔

۳۔ مبتدا سے پہلے۔ مثلاً: ﴿ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلاَّ إِلَهٌ وَاحِدٌ ﴾ [المائدة: ٧٣] ایک الہ کے علاوہ کوئی اور الہ ہے ہی نہیں۔

۳۔ ایسا نکرہ جو نفی کو لازم ہو۔ جیسے: دیار لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نوح علیہ السلام سے نقل کیے ہوئے قول میں ہے: ﴿ لا تَذَرْ عَلَى الأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيارًا ﴾ [نوح: ٢٦] اے اللہ! زمین پر کافروں کا کوئی بھی گھر نہ چھوڑ۔

ان مقامات کے علاوہ باقی جگہوں پر نکرہ ظاہر تو ہوتا ہے لیکن نص نہیں ہوتا، جیسے لا مشابہ بلیس کا اسم۔ مثال کے طور پر آپ کا یہ قول: «لا رجل في الدار» آدمی گھر میں نہیں ہے۔

عام کے لفظ کی دلالت اور اس کے استعمالات:

لفظ عام میں اصول یہ ہے کہ اس کی دلالت کلی ہونی چاہیے یعنی اس پر لگایا جانے والا حکم اس کے تحت آنے والے افراد میں سے ہر فرد پر ہونا چاہیے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جس اس میں تخصیص داخل نہ ہو، یہ وہ عام ہوتا ہے جو اپنے عموم پر باقی رہتا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے (یعنی یہ کہ اس عموم کی تخصیص نہ آئے) اس (عموم پر باقی رہنے والے عام) کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

١۔ اللہ رب العزت کا یہ فرمان: ﴿ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الأَرْضِ إِلاَّ عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾ [هود: ٦] زمین پر جو بھی جاندار ہے، اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔

۲۔ اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيءٍ عَلِيمٌ ﴾ [البقرة: ٢٨٢] اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب اچھی طرح جاننے والے ہیں۔

۳۔ اور اللہ رب العالمین کا یہ فرمان بھی: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣] تم پر اپنی ماؤں سے نکاح کرنا حرام کر دیا گیا ہے۔

بعض اوقات عام کا لفظ بول کر اس سے عام کے بعض افراد مراد ہوتے ہیں۔ یہ وہ عام ہوتا ہے جس سے کچھ خاص افراد مراد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ رب کائنات کا یہ فرمان مبارک ہے: ﴿ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ﴾ [آل عمران:۱۷۳] جب انہیں لوگوں نے کہا۔

یہاں پر 'ناس'، یعنی لوگوں سے مراد صرف نعیم بن مسعود یا اس کے علاوہ کوئی شخص ہے۔

اسی طرح اللہ رب العزت کا یہ فرمان عالیشان بھی: ﴿ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾ [النساء:٥٤] یا پھر وہ لوگوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان (لوگوں) کو اپنے فضل سے نوازا ہے۔

تو یہاں پر 'ناس' سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں۔

اور کبھی عام لفظ بولا جاتا ہے پھر اس میں تخصیص داخل ہو جاتی ہے، یہ مخصوص عام ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے:

﴿ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوءٍ ﴾ [البقرة:٢٢٨] اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ تین حیض تک انتظار کریں (یعنی عدت گزاریں)۔

تو یہاں پر لفظ 'مطلقات' عام ہے جس کی تخصیص اللہ رب العالمین کے اس فرمان کے ذریعے کی گئی ہے: ﴿ وَأُوْلاتُ الأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق:٤] اور حیض والی (طلاق یافتہ) عورتوں کی عدت کی مدت ان کے وضع حمل تک ہے۔

تو اس طرح ان حاملہ مطلقات کی عدت وضع حمل تک ہے نہ کہ تین حیض تک۔

نبی ﷺ کے ساتھ خاص خطاب کے حکم کا عموم:

نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص خطاب میں جو حکم ہوتا ہے وہ امت کو بھی شامل ہوتا ہے۔ ہاں اگر کوئی دلیل مل جائے تو پھر وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہو گا۔

زیر بحث قاعدے کے دلائل میں سے ایک دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ذیشان ہے: " ﴿ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَي لا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ﴾ [الأحزاب:٣٧] " تو جب زید (رضی اللہ

عنہ) اس (زینب رضی اللہ عنہا) سے اپنی حاجت پوری کرلی تو ہم نے آپ ﷺ سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مؤمنوں پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی حرج نہ ہو، جب ان کے منہ بولے بیٹے اپنی ضرورت کو پورا کرلیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورتوں کے متعلق فرمان: " ﴿ خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ [الأحزاب: ٥٠] " یہ حکم صرف آپ ﷺ کے لیے ہے، مؤمنوں کے لیے نہیں ہے۔

تو اگر نبی ﷺ کے ساتھ خطاب کا حکم صرف آپ ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہوتا تو پہلی آیت میں حکم کی وجہ بیان کرنا درست نہیں تھا اور دوسری آیت میں تخصیص بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اعتبار الفاظ کے عموم کا کیا جائے گا، اسباب کے خصوص کا نہیں:

جب کوئی عموم کا لفظ کسی خاص سبب سے نصوص میں وارد ہو تو وہ حکم اپنے عموم سے نہیں گرے گا، سبب چاہے کوئی سوال ہو یا کوئی اور چیز۔ جیسا کہ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ میمونہ رضی اللہ عنہا کی مردہ بکری کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أيما إهاب دبغ فقد طهر» جو کھال بھی رنگ لی جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔

اسی قاعدے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی خاص اسباب کی وجہ سے وارد ہونے والے عمومات سے بغیر کسی اختلاف کے استدلال کرتے تھے۔ ان ساری دلیلوں میں سب سے زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ جب ایک انصاری نے ایک اجنبی عورت کا بوسہ لیا اور یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ﴾ [هود: ١١٤] یقیناً نیکیاں برائیاں ختم کردیتی ہیں۔

تو اس نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کے حکم کے متعلق پوچھا کہ کیا یہ میرے لیے خاص ہے؟ اس صحابی کے الفاظ یہ ہیں: "ألي هذا وحدي؟" کیا یہ صرف میرے لیے ہے؟

تو اسے نبی ﷺ نے جو جواب دیا وہ اس حکم کے عام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «**بل لأمتي كلهم**» نہیں! بلکہ میری ساری امت کے لیے یہ حکم ہے۔

لغت کے اعتبار سے اس قاعدے کی وضاحت اس مثال کے ذریعے ہو جائے گی کہ اگر ایک آدمی سے اس کی بیوی کہے کہ: مجھے طلاق دو۔ اور وہ اللہ کا بندہ اپنی سب بیویوں کو طلاق دے دے تو یہ طلاق اس کی سب بیویوں پر واقع ہو جائے گی، طلاق کا مطالبہ کرنے والی کے ساتھ خاص نہیں ہو گی۔

مفرد پر عام کا حکم لگانے سے اس عام کا عموم ختم نہیں ہو گا:

جب کسی ایسے عام کو ذکر کیا جائے جس پر کوئی حکم لگایا گیا ہو، پھر یہ حکم اس عام کے بعض افراد پر لگا دیا جائے تو اس طرح اس عام کا عموم ختم نہیں ہو گا۔ اس میں ابو ثور نے اختلاف کیا ہے۔ اس حکم لگانے میں برابر ہے کہ عام کے افراد اکٹھے ذکر کیے گئے ہوں—جیسے: ﴿ **تَنَزَّلُ الْمَلاَئِكَةُ وَالرُّوحُ** ﴾ [القدر: ٤] روح (جبریل امین) اور فرشتے نازل ہوتے ہیں—یا پھر علیحدہ علیحدہ۔ جیسا کہ یہ حدیث ہے: «**أيما إهاب دبغ فقد طهر**» جو کھال بھی رنگ لی جائے وہ پاک ہو جاتی ہے۔

اس مسلم کی اس حدیث کے ساتھ کہ نبی ﷺ ایک مردہ بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا: «**هلا أخذتم إهابها فانتفعتم به**» تم نے اس کی کھال کیوں نہ پکڑ لی کہ اس کے ذریعے تم فائدہ اُٹھا لیتے۔

اسی طرح یہ حدیث: «**من وجد متاعه عند رجل قد أفلس فهو أحق به من الغرماء**» جو شخص اپنے مال کو ایک دیوالیہ آدمی کے پاس پا لے تو باقی قرض خواہوں کے نسبت وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

اس حدیث کے ساتھ: «إذا ابتاع الرجل سلعة ثم أفلس وهي عنده فهو أحق بها من الغرماء» جو آدمی کوئی سودا خریدے پھر دیوالیہ (مفلس) ہو جائے اور وہ مال اس کے پاس ویسے ہی پڑا ہو تو مال کا مالک باقی قرض خواہوں کی نسبت اس مال کا زیادہ حق دار ہے۔

اسی طرح جابر رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح بات کہ: "قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم بالشفعة في كل شيء" نبی کریم ﷺ نے ہر چیز میں شفعہ کا فیصلہ دیا ہے۔

اس حدیث کے ساتھ: «فإذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة» جب حدیں واقع ہو جائیں اور راستے الگ الگ ہو جائیں تو پھر کوئی شفعہ نہیں ہے۔

عام کے بعض افراد پر عام کا حکم لگانے کا فائدہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس طرح اس فرد کے عام سے نکل جانے کے احتمال کی نفی کر دی جاتی ہے۔

ان الفاظ کا بیان جو عام کے درجے پر ہوتے ہیں یا عام کے قائمقام ہوتے ہیں

عموم کے قائمقام کے بارے میں اصولیوں کے ہاں ایک مسجع عبارت مشہور ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے۔ عبارت یہ ہے: " «ترك الاستفصال في حكاية الحال مع قيام الاحتمال يتزل متزلة العموم في المقال ويحسن به الاستدلال» " حال کی حکایت میں احتمال ہونے کے باوجود تفصیل طلب کرنے کو ترک کر دینا بات میں عموم کے قائمقام ہے اور اس سے استدلال کرنا درست ہے۔

اس قاعدے کی مثالوں میں سے ایک مثال نبی ﷺ کی غیلان ثقفی کو کہی گئی یہ بات ہے جب وہ مسلمان ہوئے تھے اور اس وقت ان کے پاس دس بیویاں تھیں: " «أمسك منهن أربعًا وفارق سائرهن» " ان میں سے چار کو رکھ لے اور باقیوں کو چھوڑ دے۔

آپ ﷺ نے غیلان ثقفی سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے ان عورتوں سے اکٹھی ہی شادی کی تھی یا ترتیب سے۔ تو یہ بات دونوں حالتوں میں فرق کے نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

خاص:

تعریف: عام کے مقابلے میں خاص ہوتا ہے۔ عام ایک سے زائد چیزوں کو بغیر حصر کے شامل ہوتا ہے تو خاص صرف ایک چیز پر ہی مشتمل ہوتا ہے، مثلاً زید۔ یا ایک سے زیادہ کو شامل تو ہوتا ہے لیکن حصر کے انداز میں۔ جیسے دو یا پانچ یا سو، کیونکہ یہاں پر یہ ان اعداد کے ساتھ خاص ہے۔ اسی طرح وہ نکرہ جو اثبات کے سیاق میں ہو، جیسے آپ کا یہ کہنا کہ میں نے گھر میں ایک آدمی دیکھا یا میں نے ایک غلام آزاد کیا تو اگرچہ یہ بات ہر آدمی کے متعلق صحیح ہے اور کسی بھی غلام پر صادق آسکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ صرف ایک ہی شخصیت پر صادق آتی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے گھر میں ایک آدمی دیکھا اور میں نے ایک غلام آزاد کیا۔

تخصیص:

تعریف: لغت میں تخصیص الگ کرنے کو کہتے ہیں۔

اصطلاح میں عام کے حکم کو اس کے بعض افراد پر کسی دلیل کی وجہ سے جو اس پر دلالت کر رہی ہو، قصر کرنے (بند کرنے، روکنے) کو تخصیص کہتے ہیں۔

یعنی عام کے لیے ثابت حکم کو اس (عام) کے بعض افراد کو نکال کر باقیوں پر محصور اور مقصور کرنے کو تخصیص کہتے ہیں۔ اور کبھی متعدد کو اس کے بعض افراد پر مقصور کرنے سے بھی تخصیص ہوتی ہے۔

مثالیں:

① **عام کو قصر کرنا۔** جیسے کہ اللہ رب العالمین کا فرمان ہے: ﴿ **يوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلادِكُمْ** ﴾ [النساء: ١١] اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں۔

تو یہ حکم عام ہے اور مخاطب جتنے بھی لوگ ہیں سب کی اولاد کو شامل ہے اور ہر بچے کے بارے میں عام ہے۔ تو اس میں نبی کریم ﷺ کے اس فرمان گرامی کے ذریعے تخصیص پیدا کی گئی ہے: «**إنا معاشر الأنبياء لا نورث**» ہم انبیاء کا گروہ ہیں، ہم کسی کو وارث نہیں بناتے۔

تو اس طرح انبیاء کی اولاد کو آیت کے عموم میں تمام مخاطبین کی اولاد سے الگ کرلیا گیا ہے۔
نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: «لا یرث المسلم الکافر...» مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا۔ تو اس حدیث کے ذریعے کافر اولاد کو نکال کر (آیت میں موجود) تمام اولاد کے عموم کی تخصیص کردی گئی ہے۔

② متعدد کو قصر کرنا۔ جیسا کہ مثال کے طور پر آپ کہتے ہیں: میں نے اس کے تین کم دس دینار دینے ہیں۔

تو یہاں پر قرض کو سات دیناروں پر قصر کیا گیا ہے۔
تو اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ عام ہو یا متعدد، جس سے بھی بعض کو نکالا جائے گا تو وہ مخصوص عام بن جائے گا جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔

۲۔ خارج کرنے والی دلیل۔ اسے مخَصِّص کہتے ہیں (اسم فاعل کے صیغے کے ساتھ) جیسے کہ مذکورہ بالا دونوں حدیثیں اور آخری مثال میں مذکور استثنیٰ۔

مخَصِّصات:

عام کی تخصیص کرنے والی اشیاء کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ متصل ۲۔ منفصل

۱۔ **متصل:** وہ مخَصِّص ہے جس کا اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں ہوتا بلکہ اسکے معنیٰ کا لفظ کے ساتھ ایک تعلق ہوتا ہے تو اس طرح یہ اس عام سے ہمیشہ ملا رہتا ہے۔

۲۔ **منفصل:** وہ مخصص ہے جس کا اپنا ذاتی وجود ہوتا ہے اور تذکرہ میں اس کا عام سے لفظی طور پر یا کسی اور طریقے سے کوئی ربط اور تعلق نہیں ہوتا۔

مخَصِّصات متصلہ:

یہ پانچ چیزیں ہیں:

۱۔ استثناء ۲۔ شرط ۳۔ صفت

۴۔ غایت (انتہاء) ۵۔ بدل بعض

① استثناء کے ذریعے تخصیص:

تعریف: عام کے بعض افراد کو اس سے 'إِلَّا' یا اس جیسے دوسرے الفاظ کے ذریعے خارج کرنا۔

اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ متصل ۲۔ منقطع

۱۔ متصل وہ مستثنیٰ ہوتا ہے جو مستثنیٰ منہ (جس سے استثناء کیا جائے) کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العالمین کا فرمان گرامی ہے: ﴿ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلاَّ خَمْسِينَ عَامًا ﴾ **[العنكبوت: ١٤]** تو وہ (نوح علیہ السلام) ان (کافروں، مشرکوں) میں پچاس کم، ہزار سال ٹھہرے۔

اس قسم کے ذریعے تخصیص کرنے پر سب کا اتفاق ہے۔

۲۔ منقطع وہ مستثنیٰ ہوتا ہے جو مستثنیٰ منہ کا حصہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ "میں نے اس کے دس دینار دینے ہیں سوائے کتاب کے۔"

اس قسم کے ذریعے تخصیص کرنے میں اختلاف ہے، اس کو اگر درست مانیں جیسا کہ مالکیہ کے نزدیک ہے، اس کی تاویل کرنے کی ضرورت ہے یعنی "میں نے اس کے دس دینار دینے ہیں سوائے کتاب کی قیمت کے" تو یہاں پر دس دیناروں میں سے کتاب کی قیمت کا استثناء کیا گیا ہے تو گویا کہ یہ قسم بھی عملی طور پر پہلی قسم ہی بن جاتی ہے۔

استثناء کے صحیح ہونے کی شرائط:

اسثناء کے ذریعے تخصیص کرنے کے لیے کچھ شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ ان میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مستثنیٰ لفظوں میں ہو کہ اس کو سنا جائے، صرف نیت نہ کرلی جائے۔ البتہ مالکیوں کے نزدیک جبری قسم میں اگر ایسا نہ کیا جائے تو جائز ہے۔

۲۔ عرف عام میں یہ ما قبل سے لفظی طور پر متصل ہو۔ البتہ سانس لینے یا چھینک آجانے سے اگر فاصلہ آجائے تو کوئی بات نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس میں اختلاف کیا ہے، ان کے نزدیک منقطع مطلقاً جائز ہے۔

۳۔ مستثنی، مستثنی منہ کو بالکل ہی اپنے اندر لینے والا نہ ہو، جیسا کہ میں نے اس کے پانچ دینار دینے ہیں سوائے پانچ دیناروں کے۔ کیونکہ اس طرح کا استثناء تو بالکل لغو اور فضول ہے۔ حنابلہ کے نزدیک مستثنی کو مستثنی منہ کے نصف سے زیادہ بھی نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ میں نے اس کے پانچ دینار دینے ہیں سوائے تین دیناروں کے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ استثناء قلیل کو نکالنے کے لیے ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے آخری شرط میں اختلاف معلوم ہوتا ہے، اس کی تین صورتیں بنتی ہیں، جیسا کہ حسب ذیل تفصیل سے معلوم ہوگا۔

۱۔ یہ کہ مستثنی، باقی بچ جانے والی چیز سے کم ہو، جیسا کہ میں نے اس کے پانچ دینار دینے ہیں سوائے دو کے۔ تو یہ صورت بالاجماع صحیح ہے۔

۲۔ یہ کہ مستثنی، مستثنی منہ کو مکمل طور اپنے اندر شامل کرنے والا ہو، جیسا کہ میں نے اس کے پانچ دینار دینے ہیں سوائے پانچ دیناروں کے۔ تو یہ صورت ابن طلحہ اندلسی کے علاوہ اکثر کے نزدیک باطل ہے۔

۳۔ یہ کہ مستثنی باقی بچ جانے والی چیز سے زیادہ ہو، جیسا کہ میں نے اس کے پانچ دینار دینے ہیں سوائے چار دیناروں کے۔ تو یہ صورت جمہور کے نزدیک جائز ہے جبکہ حنابلہ کے نزدیک ممنوع ہے۔

جملہ ہائے معطوفہ کے بعد استثناء کا آنا:

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِينَ يرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (٤) إِلاَّ الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

[النور : ٤، ٥] اور وہ لوگ جو پاک دامن عورتوں پر تہمت دھرتے ہیں، پھر چار گواہ بھی نہیں لاتے تو انہیں اسی (٨٠) کوڑے مارو اور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کرلی تو یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ بہت زیادہ بخشنے والے، بہت زیادہ مہربان ہیں۔

اس آیت میں استثناء تین جملوں کے بعد آیا ہے:

۱۔ کوڑے مارنے کا حکم والا جملہ

۲۔ ان کی گواہی قبول کرنے کی ممانعت والا جملہ

۳۔ ان کو فاسق قرار دینے والا جملہ

تو اب یہاں پر اس بارے میں اختلاف ہے کہ استثناء ان سب جملوں سے ہے یا صرف آخری جملہ سے۔

۱۔ جمہور کا کہنا ہے کہ ان تمام جملوں سے استثناء ہے کیونکہ یہی بات ظاہر ہے اور اس کے خلاف کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ تو اس استثناء کو صرف کوڑے مارنے والے جملہ کی طرف لوٹانا صحیح نہیں ہے۔

۲۔ ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ یہ استثناء صرف آخری جملہ سے ہوگا کیونکہ یہی بات یقینی ہے۔

استثناء کا مفردات ہائے معطوفہ کے بعد آنے کی مثال بھی ایسے ہی ہے۔ مثلاً: فقیروں، مسکینوں اور چٹی بھرنے والوں پر صدقہ پر سوائے ان کے جو ان میں سے فاسق ہیں۔

② شرط کے ذریعے تخصیص:

تعریف: یہاں پر شرط سے لغوی شرط مراد ہے۔ اور لغوی شرط کہتے ہیں "ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ لٹکا دینا، معلق کر دینا"

کلمات شرط بہت سارے ہیں، 'إِنْ' اور 'إِذَا' انہی میں سے ہیں۔ مثال کے طور پر: «إن نجح زيد فأعطه جائزة» اگر زید کامیاب ہوا تو میں اسے انعام دوں گا۔

گزشتہ مثال میں شرط کے ذریعے تخصیص کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس شرط کے ذریعے زید کے مختلف حالات میں سے ناکامی والی حالت کو نکال دیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر شرط نہ ہوتی تو زید کو ہر حال میں انعام دینا ضروری ہو جاتا۔

اللہ رب العالمین کا فرمان گرامی ہے: ﴿ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الأَرْضِ فَلَيسَ عَلَيكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلاةِ ﴾ [النساء: ١٠١] اور جب تم زمین پر چلو (یعنی سفر کرو) تو نماز قصر کرنے میں تم پر کوئی حرج (گناہ) نہیں۔

تو یہاں پر نماز قصر کرنے کو سفر کرنے کی شرط کے پورا ہونے پر معلق رکھا گیا ہے۔ تو اگر یہ شرط نہ ہوتی تو سفر ہو یا حضر ہر حال میں قصر کرنا جائز ہوتا۔ لیکن اس (نماز قصر کرنے) کو حالت سفر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔

شرط کے ذریعے تخصیص کرنے کے لیے شرط کا مشروط سے ملا ہونا ضروری ہے جیسا کہ استثناء میں بھی یہ شرط ہے۔

③ صفت کے ذریعے تخصیص:

صفت سے مراد صفت معنوی ہے، علم نحو میں معروف نعت (موصوف والی صفت) نہیں ہے، لہٰذا یہ صفت حال، ظرف، تمیز وغیرہ کو شامل ہوتی ہے۔

صفت کے ذریعے تخصیص میں اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صفت اپنے ماقبل موصوف کی تخصیص کرتی ہے اور بسا اوقات صفت موصوف سے پہلے بھی آجاتی ہے جیسا کہ اس وقت ہوتا ہے جب صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا جاتا ہے۔

صفت کے ذریعے تخصیص کرنے کی صورت یہ ہے کہ یہ حکم کو صرف اسی چیز پر مقصور کر دیتی ہے جس پر صادق آتی ہے اور جب اس کا مفہوم معتبر ہو تو وہ حکم کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔

١۔ مثلاً: "اقرأ الكتب النافعة في البيت" گھر میں بیٹھ کر مفید کتابیں پڑھو۔

تو آپ کا اپنے دوست سے کہنا کہ: "کتاب پڑھو" ہر کتاب کے بارے میں عام ہے لیکن یہاں پر مفید کا وصف پڑھنے کے حکم کو صرف مفید کتابیں پڑھنے کے حکم پر مقصور کر رہا ہے اور باقیوں کو اس حکم سے نکال رہا ہے۔

۲۔ اسی طرح "کتاب پڑھو" تو یہ حکم ہر جگہ کے بارے میں عام ہے کہ کہیں پر بھی جا کر پڑھ لو، لیکن آپ کا یہ کہنا کہ "گھر میں بیٹھ کر" یہ باقی جگہوں کے علاوہ صرف گھر میں پڑھنے پر حکم کو محصور کر رہا ہے۔

۳۔ آپ کا یہ کہنا: «إذا حضرت مبكرًا أدركت الدرس الأول» جب آپ صبح سویرے حاضر ہوں گے تو پہلے سبق کو پالیں گے۔

تو یہاں پر حاضر ہونا تمام اوقات کے لیے عام ہے لیکن " مبكرًا " نے اس کی تخصیص کر دی ہے۔

صفت کے ذریعے تخصیص کی مثالوں میں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿ وَمَن لَّمْ يسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلاً أَن ينكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيمَانُكُم مِّن فَتَياتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ﴾ [النساء: ٢٥] اور تم میں سے جو آزاد مؤمنہ عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھے تو وہ مؤمنہ لونڈیوں سے، جن کے تم مالک ہو، اپنا نکاح کر لو۔

تو یہاں پر لفظ «فتیاتکم» عام ہے جس کی تخصیص " المؤمنات " کے وصف سے کی گئی ہے۔

صفت کے ذریعے تخصیص کرنے کی شرط یہ ہے کہ صفت موصوف سے لفظاً ملی ہوئی ہو جیسا کہ شرط اور استثناء میں بھی یہ بات گزری ہے۔

④ غایت کے ذریعے تخصیص:

کسی چیز کی انتہا کو غایت کہتے ہیں، اس کے لیے کچھ حروف مقرر ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں، اور وہ یہ ہیں: ۱۔ اِلی ۲۔ حتی

اور یہ غایت وہ ہے کہ جس سے پہلے والا عموم اس کے بعد والی چیز کو شامل ہوتا ہے کیونکہ یہ بعد والی چیز کو ماقبل کے عموم سے خارج کر دیتا ہے۔

اس کی مثال: اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِينَ لا يؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلا بِالْيوْمِ الآخِرِ وَلا يحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلا يدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴾ [التوبة:٢٩]

اہل کتاب میں سے جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں مانتے اور نہ ہی دین حق کو دین بناتے ہیں، ان سے اس وقت تک لڑو جب تک وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا نہ کر دیں۔

تو یہاں پر غایت سے پہلے لڑائی کا حکم عام ہے جو ہر حال میں ضروری ہے۔ تو اگر یہاں غایت کے ذریعے تخصیص نہ ہوتی تو ہم لوگ ان اہل کتاب سے لڑائی پر مامور ہی رہتے، چاہے وہ جزیہ دیتے یا نہ دیتے۔

⑤ بدل بعض کے ذریعے تخصیص:

جب آپ کہیں کہ: «أكرم القوم العلماء منهم» پوری قوم میں سے علماء کی عزت کرو۔

تو آپ نے قوم کے عموم کو بدل کر اکرام کو علماء کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ بعض کے ہاں بدل کی یہ قسم مخصِّص ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

اس بدل بعض کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ فرمان الٰہی بھی ہے: ﴿ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيهِ سَبِيلاً ﴾ [آل عمران:٩٧] لوگوں میں سے جو لوگ راستے کی طاقت رکھتے ہیں ان کے لیے اللہ کے واسطے حج کرنا فرض ہے۔

تو یہاں پر 'الناس' کا لفظ عام ہے جو ہر طاقت رکھنے والے اور نہ رکھنے والے کو شامل ہے، لیکن جب اس کے بعد بدل بعض ذکر کیا گیا تو اس کو صرف طاقت رکھنے والوں سے خاص کر دیا گیا۔

مخصِّصات منفصلہ:

منفصل مُخصِّص کی تعریف پیچھے گزر چکی ہے۔ اس کی بھی چند اقسام ہیں، ان میں سے چند ایک کو ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

① **کتاب وسنت کی کسی نص کے ذریعے تخصیص کرنا۔** اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ یا تو کوئی آیت ہی کسی دوسری آیت کے عموم کی تخصیص کر دیتی ہے، جیسا کہ اللہ رب العالمین کا فرمان ہے : ﴿ وَالْمُطَلَّقَاتُ يتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوءٍ ﴾ [البقرة:۲۲۸] طلاق یافتہ عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ تین حیض تک انتظار کریں (یعنی عدت گزاریں)۔ ان طلاق یافتہ عورتوں میں سے حمل والیوں کی تخصیص اس آیت کے ذریعے کی گئی ہے: ﴿ وَأُوْلاتُ الأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق:٤] اور حمل والیوں کی عدت کی مدت ان کے وضع حمل تک ہے۔

اسی طرح ان طلاق یافتہ عورتوں میں سے ان عورتوں کی بھی تخصیص کی گئی ہے جن کو چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دی گئی۔ یہ تخصیص اللہ رب العزت کے اس فرمان کے ذریعے کی گئی ہے: ﴿ يا أَيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيهِنَّ مِن عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ﴾ [الأحزاب:٤٩] اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر ازدواجی تعلق قائم کرنے سے پہلے (ہی) طلاق دے دو تو ان پر تمہارا کوئی حق عدت کا نہیں ہے جسے تم شمار کرو۔

۲۔ یا پھر حدیث کے ذریعے آیت کے عموم کی تخصیص کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيكُمُ الْمَيتَةُ ﴾ [المائدة:۳] تم پر مردار حرام کر دیا گیا ہے۔

اس مردار میں سے مچھلی اور مکڑی (ٹڈی دَل) کی تخصیص نبی کریم ﷺ کی اس حدیث کے ذریعے کی گئی ہے: «أحلت لنا ميتتان ودمان أما الميتتان: فالجراد والحوت» ہمارے لیے دو طرح کے مردار اور دو طرح کے خون حلال کیے گئے ہیں۔ جو مردار ہیں وہ تو مکڑی اور مچھلی ہیں۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان گرامی: ﴿ وَيسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يطْهُرْنَ ﴾ [البقرة:۲۲۲] وہ آپ ﷺ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ فرما دیجئے کہ وہ ایک تکلیف اور اذیت

ہے تو تم حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔

اس کی تخصیص اس روایت سے کی گئی ہے جو عائشہ و ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی کسی بیوی کو ازار باندھنے کا حکم دیتے تھے، تو اس طرح اس سے حیض کی حالت میں جسم سے جسم ملاتے تھے۔

٣۔ یا پھر حدیث کے عموم کی تخصیص کوئی آیت کرتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کا فرمان گرامی ہے: **«ما أبين من حي فهو ميت»** زندہ میں سے جو چیز بھی جدا کر لی جائے تو وہ مردار ہے۔

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ذریعے تخصیص کی گئی ہے: ﴿ **وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَى حِينٍ** ﴾ **[النحل: ٨٠]** اور ان کی اون اور روؤں اور بالوں سے بھی اس نے بہت سے سامان اور ایک وقت مقررہ تک کے لیے فائدہ کی چیزیں بنائیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: **«إذا التقى المسلمان بسيفيهما فالقاتل والمقتول في النار»** جب دو مسلمان اسلحہ لے کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آجائیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں جائیں گے۔

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ذریعے تخصیص کی گئی ہے: ﴿ **فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ** ﴾ **[الحجرات: ٩]** تو تم باغی گروہ سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ رب العالمین کے حکم کی طرف لوٹ آئیں۔

٤۔ یا پھر ایک حدیث دوسری حدیث کے عموم کی تخصیص کرتی ہے۔ مثال کے طور پر نبی ﷺ کا فرمان گرامی ہے: **«فيما سقت السماء العشر»** جس کھیتی کو بارش سیراب کرے ،اس میں عشر ہے۔

مذکورہ بالا فرمان کی اس فرمان کے ذریعے تخصیص کی گئی ہے: «ليس فيما دون خمسة أوسق صدقة» پانچ وسق سے کم کھیتی کی پیداوار میں زکاۃ نہیں ہے۔

② اجماع کے ذریعے تخصیص کرنا۔ مثال کے طور پر اللہ رب العالمین کا فرمان ہے:

﴿ يوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنثَيَينِ ﴾ [النساء: ١١] اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں۔ ایک مذکر کے لیے دو مؤنثوں کے حصہ کے برابر ہے۔

تو یہاں پر اجماع کے ذریعے غلام کے بیٹے کی تخصیص کی گئی ہے۔ اسی طرح دھوکے والی بیع سے روکنے والی احادیث کے عموم سے اجماع کے ذریعے مضاربت کے جواز کی تخصیص کی گئی ہے۔

③ قیاس کے ذریعے تخصیص کرنا۔ مثال کے طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ الزَّانِيةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ [النور: ٢] زانی مرد و عورت میں سے ہر ایک دو سو (١٠٠) سو (١٠٠) کوڑے مارو۔

تو زانیہ عورت کے عموم سے لونڈی کی تخصیص نص کے ذریعے کی گئی ہے اور وہ نص اللہ تبارک وتعالیٰ کا درج ذیل فرمان ہے: ﴿ فَإِنْ أَتَينَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ [النساء: ٢٥] تو اگر یہ کنیزیں زنا کا ارتکاب کرلیں تو ان پر آزاد عورتوں کی سزا میں سے نصف سزا ہے۔

رہا غلام کو زانی کے عموم سے نکالنا تو ایسا غلام کو لونڈی پر قیاس کرکے کیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

④ حس کے ذریعے تخصیص کرنا۔ اس کی مثالوں میں سے ایک رب ذوالجلال والاکرام کا یہ فرمان ہے: ﴿ يجْبَى إِلَيهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيءٍ ﴾ [القصص:٥٧] اس (مکہ) کی طرف تمام چیزوں کے پھل کھچے چلے آتے ہیں۔

اسی طرح ملکہ سبا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی قاعدے کی مثال ہے: ﴿ وَأُوتِيتْ مِن كُلِّ شَيءٍ ﴾ [النمل:٢٣] اسے ہر چیز دی گئی ہے۔

تو بلاشبہ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ نہ تو مکہ (اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کریں) میں ہر طرح کے مختلف انواع واقسام کے پھل لائے جاتے ہیں اور نہ ہی بلقیس کو ہر چیز دی گئی تھی۔

⑤ عقل کے ذریعے تخصیص کرنا۔ اس کی مثالوں میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مبارک ہے: ﴿ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [الزمر: ٦٢] اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔

تو بلاشبہ عقل اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ رب ذوالجلال والاکرام کی ذات اپنی صفات کے ساتھ غیر مخلوق ہے اگرچہ 'كُلّ' کا لفظ اسے بھی شامل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلاَّ وَجْهَهُ ﴾ [القصص: ٨٨] تیرے رب کی ذات کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

دلالت کے اعتبار سے لفظ کی اقسام:

لفظ کی اپنے معنی پر دلالت کرنے کے اعتبار سے کئی حالتیں ہیں:

۱۔ یہ کہ اس میں صرف ایک ہی معنی کا احتمال ہو۔ جیسا کہ اللہ رب العالمین کا فرمان ہے: ﴿ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ﴾ [البقرة: ١٩٦] یہ پورے دس ہیں۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ﴾ [الأعراف: ١٤٢] تو ان کے رب (کی ملاقات) کا وقت چالیس راتوں کا ہو گیا۔

اس جیسی عبارتوں کا نام 'نص' رکھا جاتا ہے۔ نص کا لفظ 'منصة العروس' سے لیا گیا ہے جس کا لغوی معنی بلندی ہے۔

۲۔ یہ کہ ایک سے زیادہ معانی کا برابر طور پر احتمال رکھتا ہو۔ جیسا کہ «قرء ، عين» ہے۔ اس کا نام 'مجمل' رکھا جاتا ہے۔

۳۔ یہ کہ ایک سے زیادہ معانی کا احتمال تو رکھتا ہو لیکن ان معانی میں سے ایک معنی دوسرے معانی سے زیادہ راجح ہو۔ تو جو راجح ہوتا ہے اس کا نام 'ظاہر' رکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: «رأيت اليوم أسدًا» میں نے آج ایک شیر دیکھا۔ تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے جنگل میں دھاڑتے ہوئے شیر کو دیکھا ہو یا پھر کسی بہادر آدمی کو دیکھا ہو۔ تو یہاں پر پہلا معنی زیادہ راجح ہے۔

۴۔ اور اگر زیادہ معانی والے لفظ میں سے مرجوح معنی مرادلیا جائے تو وہ 'مؤول' ہے۔ جیسا کہ 'اسد' کے لفظ کو گزشتہ مثال میں بہادر آدمی پر فٹ کرنا۔ مرجوح معنی پر محمول کرنے کے لیے کسی قرینہ کی موجودگی ضروری ہے ورنہ ایسا کرنا باطل ہے۔

دلالت کے اعتبار سے لفظ کو صرف ان مذکورہ بالا اقسام میں محصور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ یا تو ایک ہی معنی کا احتمال رکھتا ہے یا ایک سے زیادہ معانی کا۔ تو پہلی صورت میں اس کا نام 'نص' ہے۔ اور دوسری صورت میں یا تو دو معنوں میں سے ایک معنی کا احتمال رکھتا ہے یا مختلف معانی میں سے جو اپنے غیر سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں پہلی صورت یہ ہے کہ یا تو وہ برابر برابر احتمال رکھتا ہے تو پہلے کا نام 'ظاہر' اور جو اس کے مقابلے میں ہوتا ہے اس کا نام 'مؤول' رکھتے ہیں اور دوسری صورت کا نام 'مجمل' رکھتے ہیں۔

ان اقسام کا حکم:

۱۔ نص سے صرف نسخ کے ذریعے ہی عدول (تجاوز) کیا جائے گا۔

۲۔ مجمل پر بیان کے بعد ہی عمل کیا جائے گا۔

۳۔ ظاہر کو چھوڑ کر مؤول کی طرف صرف کسی مضبوط قرینہ کی وجہ سے ہی منتقل ہوا جائے گا جو مرجوح جانب کو راجح بنادے۔

اس کی مثال 'جار' کا لفظ ہے جو اس حدیث «**الجار أحق بسقبه**» میں ہے۔ تو اس میں راجح معنی ہمسایہ ہے۔ اور مرجوح معنی ساتھی ہے۔ تو حنابلہ نے اسے شریک پر محمول کیا ہے حالانکہ وہ مرجوح معنی ہے، انہوں نے یہ کام ایک مضبوط قرینہ کے وجہ سے کیا ہے۔ اور یہ قرینہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان گرامی ہے: «**فإذا ضربت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة**» جب حدود مقرر ہو جائیں اور راستے علیحدہ ہو جائیں تو پھر شفعہ کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

تو انہوں نے کہا کہ: حدود کا مقرر ہونا اور راستوں کا علیحدہ ہونا صرف شراکت میں ہی ممکن ہے کیونکہ ہمسایوں کی تو پہلے ہی حدیں مقرر اور راستے الگ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا ہے کہ: ہمسایہ کے لیے شفعہ ہے ہی نہیں۔

مجمل اور مُبَیَّن:

① مجمل

تعریف: لغت میں جو چیز جمع کی گئی ہو اسے مجمل کہتے ہیں، اور کسی چیز کا جملہ اس کا مجموعہ ہوتا ہے جیسے حساب کا جملہ (یعنی ٹوٹل)۔

اصطلاح میں: اس لفظ کو کہتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ معنوں کا احتمال رکھتا ہوں، اس طرح کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہ ہو یا ان کئی معنوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہ ہو۔

اس کی مثالوں میں سے ایک لفظ 'قرء' ہے جو دو معنوں کے درمیان برابر طور پر متردد ہے، یعنی طہر اور حیض۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔ اسی تردد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں لفظ 'قرء' کی مراد سمجھنے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوءٍ﴾ [البقرة:۲۲۸] اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ تین قرء تک انتظار کریں یعنی عدت گزاریں۔

تو امام شافعی اور امام مالک رحمہا اللہ نے اسے طہر پر محمول کیا ہے اور ابو حنیفہ اور احمد رحمہا اللہ نے اسے حیض پر محمول کیا ہے۔

اجمال کی اقسام:

اجمال کبھی مرکب ہوتا ہے اور کبھی مفرد، کبھی اسم ہوتا ہے، کبھی فعل اور کبھی حرف اور کبھی تو محذوف حرف کے تعین میں اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مثالیں:

۱۔ **مرکب میں اجمال:** جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان علی مقام ہے: ﴿إِلاَّ أَن يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ [البقرة:۲۳۷] مگر یہ کہ وہ معاف کردیں یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔

تو جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، اس میں احتمال ہے کہ وہ شوہر بھی ہو سکتا ہے اور عورت کا ولی بھی۔ اسی وجہ سے امام احمد اور امام شافعی رحمہا اللہ نے اس کو شوہر پر محمول کیا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے اسے عورت کے ولی پر محمول کیا ہے۔

۲۔ مفرد میں اجمال:

۱۔ **اسم میں اجمال:** اس کی مثال والا لفظ پیچھے گزر چکا ہے جو 'قرء' ہے۔ اسی طرح لفظ 'عین' بھی اسی کی مثال ہے جو آنکھ، چشمہ اور نقد تینوں میں سے کسی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ **فعل میں اجمال:** جیسا کہ اللہ رب العزت کا فرمان عالی شان ہے: ﴿ وَاللَّيلِ إِذَا عَسْعَسَ ﴾ [التکویر:۱۷] رات کی قسم! جب وہ آنے / جانے لگے۔

تو عسعس کا لفظ آنے اور جانے میں تردد کی وجہ سے فعل میں اجمال کی مثال ہے۔

۳۔ **حرف میں اجمال:** جیسا کہ اللہ رب العزت کا فرمان ذیشان ہے: ﴿ فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيدِيكُم مِّنْهُ ﴾ [المائدة:٦] تو اپنے ہاتھوں اور چہروں کو دھولو۔

اب احتمال ہے کہ ہو سکتا ہے 'مِن' تبعیض کے لیے ہو یا ابتداء غایت کے لیے۔ اسی وجہ سے امام احمد اور شافعی رحمہا اللہ نے اسے تبعیض کے لیے مانا ہے اور امام مالک اور ابو حنیفہ رحمہا اللہ نے اسے ابتداء غایت پر محمول کیا ہے۔

۴۔ **محذوف حرف کے تعین میں اختلاف کی وجہ سے اجمال:** جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ ﴾ [النساء:۱۲۷] تم ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو۔ یا تم ان سے نکاح کرنے سے بے رغبتی اختیار کرتے ہو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہو سکتا ہے 'وَتَرْغَبُونَ' کے بعد 'فِی' محذوف ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم ان سے ان کی خوبصورتی کی وجہ سے نکاح کرنے میں دلچسپی رکھتے ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محذوف حرف 'عَن' ہو یعنی تم ان سے ان کی غربت اور بدصورتی کی وجہ سے نکاح کرنے سے اعراض کرتے ہو۔

مجمل میں عمل: سب سے پہلے دیکھا جائے گا کہ یہاں کوئی قرینہ یا ایک معنی کو ترجیح دینے والی کوئی چیز موجود ہے یا نہیں۔ اگر کوئی قرینہ یا ترجیح پائی جائے تو اسی کے مطابق عمل کیا جائے اور اگر کوئی چیز نہ ملے تو اس سے استدلال کرنا چھوڑ دیا جائے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ: " **إذا وجد الاحتمال بطل الاستدلال** " جب احتمال پایا جائے تو استدلال کرنا باطل ہو جاتا ہے۔

ان نصوص کا بیان جو مجمل نہیں ہیں:

۱۔ **کسی خاص چیز کی طرف حرمت کی اضافت:** جیسا کہ اللہ رب العالمین کا فرمان ذیشان ہے: " ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ ﴾ [النساء:۲۳] " تم پر تمہاری مائیں حرام کر دی گئی ہیں۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان گرامی: " ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيكُمُ الْمَيتَةُ ﴾ [المائدة:۳] " تم پر مردار حرام کر دیا گیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہ دونوں فرامین مبارکہ مجمل نہیں ہیں کیونکہ یہ بات عرف میں مشہور ہے کہ پہلے فرمان میں نکاح کرنا حرام ہے اور دوسرے فرمان میں کھانا۔

۲۔ رب کائنات کا فرمان عالی شان ہے: " ﴿ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ ﴾ [المائدة:٦] " اپنے سروں کا مسح کرو۔

یہ فرمان گرامی بھی مجمل نہیں ہے بلکہ یہاں پر یہ بات ظاہر ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا، بعض حصہ کا نہیں کیونکہ 'رأس' کا لفظ پورے سر کے لیے ہے نہ کہ اس کے بعض حصہ کے لیے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے: " «رفع عن أمتي الخطأ والنسيان» " میری امت سے غلطی اور بھول چوک کو اُٹھا دیا گیا ہے۔

یہ عالی مرتبت ارشاد مجمل نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد مواخذہ کا ختم ہونا ہے۔ غلطی اور نسیان ذاتی طور پر ختم نہیں کیے گئے۔ غلطی سے یا بھول چوک سے کسی کا نقصان کر دینے کی چٹی بالاجماع معاف نہیں ہے لہٰذا اس فرمان سے صرف مواخذے کا نہ ہونا ہی مراد ہے۔

۴۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "«لا صلاة إلا بطهور» "وضو کے بغیر نماز نہیں ہے۔" «لا نكاح إلا بولي» "ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔" «لا صيام لمن لم يبيت الصيام من الليل» "جو شخص رات کو ہی روزے کی نیت نہ کرے تو اس کا روزہ نہیں ہے۔

اور اسی طرح کے دیگر فرامین مجمل نہیں ہیں کیونکہ اس سے مراد شرعی طور پر نماز، نکاح اور روزے وغیرہ کا صحیح نہ ہونا۔

۵۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے: "«لا عمل إلا بنية» "نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں ہے۔

یہ فرمان گرامی بھی مجمل نہیں ہے کیونکہ عمل:

۱۔ اگر عبادت ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ عبادت شرعی طور پر درست نہیں ہے۔

۲۔ اور اگر معاملہ ہے تو وہ بالاجماع نیت کے بغیر ہی صحیح ہوتا ہے اور اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اس میں نفی کو اجر حاصل کرنے پر محمول کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر جس نے امانت اور غصب شدہ چیز واپس کی اور اس پر اللہ کی رضامندی کا ارادہ نہیں کیا تو اس سے اس چیز کا مطالبہ تو ختم ہو جائے، اس کا فعل درست ہو گا اور اس کا اعتماد بھی کیا جائے گا لیکن اس بندے کے لیے کوئی اجر نہیں ہو گا۔ اسی طرح باقی مثالیں بھی سمجھ لیں۔

② مبین:

۱۔ **مبَیَّن (یا کے فتح کے ساتھ)** اس کا مطلب ہوتا ہے واضح، اور یہ مجمل کا متضاد ہے چونکہ یہ اپنے معنی میں واضح ہوتا ہے اس لیے کسی خارجی وضاحت کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کا دوسرا نام 'بیان' ہے۔

۲۔ **مبَیِّن (یا کے کسرہ کے ساتھ)** اسم فاعل کے وزن ہے۔ یہ مجمل کے اجمال کی وضاحت کرتا ہے۔

اصطلاح میں: خطاب کی مراد کو واضح اور کھول کر بیان کرنے والا۔ اسی راستے پر اکثر اصولیوں چلے ہیں اور انہوں نے بیان کو اس چیز کی وضاحت کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں پہلے اخفاء

موجود ہو۔ اور بعض اصولیوں نے اسے ہر وضاحت پر بولا ہے چاہے پہلے اس میں اخفاء موجود تھا یا نہیں۔

اس چیز کا تذکرہ جس میں بیان واقع ہوتا ہے:

کبھی بیان قول کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی فعل کے ذریعے اور کبھی ان دونوں کے ذریعے۔ اور کبھی ترک فعل بھی بیان کے لیے ہوتا ہے تاکہ یہ اس فعل کے عدم وجوب پر دلالت کرسکے۔

قول کے ذریعے بیان:

۱۔ **کتاب کا بیان کتاب کے ذریعے:** اللہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: ﴿ إِلاَّ مَا يتْلَى عَلَيكُمْ ﴾ [المائدة: ۱] مگر وہ چیزیں جو تم پر پڑھ دی جائیں گی۔

تو یہ ایک مجمل فرمان تھا جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں کی ہے: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيكُمُ الْمَيتَةُ وَالدَّمُ ﴾ [المائدة: ۳] تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے لیے مشہور کی گئی چیز حرام کی گئی ہے۔۔۔ الخ

۲۔ **کتاب کی وضاحت سنت کے ذریعے:** اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَآتُوا حَقَّهُ يوْمَ حَصَادِهِ ﴾ [الأنعام: ۱٤۱] اور کٹائی کے دن کھیتی کا حق ادا کرو۔

تو یہاں پر "حق" مجمل تھا جس کی وضاحت نبی کریم ﷺ نے اپنے اس فرمان کے ذریعے کی ہے: «فيما سقت السماء العشر، وفيما سقي بالنضح نصف العشر» جس کھیتی کو آسمان سیراب کرے، اس میں عشر ہے اور جس کھیتی کو محنت کرکے پانی لگایا جائے تو اس میں نصف عشر ہے۔

فعل کے ذریعے بیان:

۱۔ **یہ عمل کی صورت میں ہوتا ہے:** جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے منبر پر چڑھ کر صحابہ کرام کو نماز پڑھ کر دکھائی تاکہ لوگوں کے لیے نماز کا طریقہ واضح ہوجائے، اسی وجہ سے

آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا تھا:«صلوا كما رأيتموني أصلي» نماز ویسے پڑھا کرو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کا چور کے ہاتھ کو کلائی سے کاٹنا بھی فعل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا بیان اور وضاحت ہے: ﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُواْ أَيْدِيَهُمَا ﴾ [المائدة : ۳۸] چور مرد وعورت کے ہاتھ کاٹ دو۔

۲۔ **لکھ کر بھی ہوتا ہے:** جیسا کہ آپ ﷺ نے نصاب زکاۃ اپنے عمال کو لکھوا کر دیئے تھے۔

۳۔ **اشارہ سے بھی ہوتا ہے:** جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے اشارہ کیا تھا کہ مہینہ اتنے اتنے دن کا ہے۔ یہ اشارہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے کیا تھا، اور تیسری مرتبہ انگوٹھے کو بند کر لیا تھا، یعنی انیتس (۲۹) دن کا۔

ترکِ فعل کے ذریعے بیان: جیسا کہ آپ ﷺ نے رمضان میں چند دن تراویح پڑھانے کے بعد اسے ترک کر دیا تھا اور اسی طرح آپ ﷺ نے آگ پر پکی ہوئی چیزیں کھانے کے بعد وضو کرنا چھوڑ دیا تھا تو آپ کا ان دونوں کاموں کو ترک اس بات کی وضاحت کے لیے تھا کہ ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔

بیان کے مراتب:

بیان کے مرتبے مختلف درجوں والے ہیں، سب سے اعلیٰ قسم خطاب کے ذریعے ہے، اس سے کم فعل کے ذریعے، اس سے کم اشارہ کے ذریعے اور اس سے کم لکھ کر۔ اور یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ جان بوجھ کر کام کو ترک کرنا، فعل کی قبیل سے ہے۔

بیان کو ضرورت کے وقت سے مؤخر کرنا اور بوقت ضرورت واضح کرنا:

بیان کو مؤخر کرنے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ **اتنی تاخیر کرنا کہ عمل کا وقت آپہنچے۔** ایسا کرنا جائز ہے اور ایسا ہوا بھی ہے۔ معراج کی رات نماز مجمل طور پر فرض کر دی گئی تھی اور اس کے بیان کو اگلے دن تک مؤخر رکھا گیا تھا حتی کہ

جبریل علیہ السلام آئے اور انہوں نے اسے بیان کیا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ جانتے تھے کہ غنیمت کے مال میں پانچواں حصہ جو ﴿ وَلِذِي الْقُرْبَى ﴾ [الأنفال: ٤١] قرابت داروں کے لیے تھا، ان قرابت داروں سے مراد علاوہ بنونوفل اور بنی عبد شمس کے صرف بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب ہیں اگرچہ عبد مناف کی اولاد ہونے میں سارے برابر تھے۔ تو اس کا بیان اس وقت تک مؤخر رکھا گیا حتی کہ جبیر بن مطعم نوفلی اور عثمان بن عفان عبشمی نے آپ سے اس خمس کا مطالبہ کیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”«أنا وبنو المطلب لم نفترق في جاهلية ولا في إسلام» “میں اور بنو عبد المطلب ایک ہی ہیں، ہم نہ تو جاہلیت میں الگ ہوئے تھے، نہ ہی اسلام میں۔

اسی طرح نماز، زکاۃ اور حج کے بارے میں آیات ہیں، جن کی وضاحت سنت نے بعد میں آہستہ آہستہ کی تھی۔ اسی قاعدے پر اللہ رب العالمین کا یہ فرمان گرامی بھی دلالت کرتا ہے: ” ﴿ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (١٨) ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴾ [القيامة:١٨، ١٩] “تو جب ہم اسے پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں (۱۸) پھر اس کا واضح کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔(۱۹)

تو ان آیات میں ’ثُمَّ‘ کا لفظ تراخی (تاخیر) کے لیے آیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی دلائل ہیں۔

۲۔ **اتنی تاخیر کرنا کہ وقتِ ضرورت ہی گزر جائے۔** تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس طرح مخاطب کے لیے تکلیف مالایطاق (ایسا حکم دینا جس کی بندہ طاقت نہ رکھے) لازم آتی ہے جو جائز نہیں ہے۔

مُبَیِّن کا مُبَیَّن کے مقابلے میں درجہ:

مبَیّن (اسم فاعل کا صیغہ) ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ مبَیَّن (اسم مفعول کا صیغہ) سے سند میں یا دلالت میں زیادہ قوی ہو۔ بلکہ اخبار متواتر کا اخبار آحاد کے ذریعے اور منطوق کا مفہوم کے ذریعے بیان کرنا بالکل جائز ہے۔

مثالیں:

۱۔ **سنت کے ذریعے کتاب کا بیان:** جیسا کہ اللہ رب العزت کا فرمان گرامی ہے: ﴿ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ﴾ [البقرة: ۲۳۰] تو اگر خاوند اپنی بیوی کو (تیسری) طلاق (بھی) دے دے تو جب تک وہ کسی اور سے شادی نہ کر لے (اور اس سے طلاق یا بیوگی کی صورت اختیار نہ کرے) پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہو گی۔

تو نبی کریم ﷺ نے اس بات کو واضح فرمادیا کہ نکاح ثانی سے مراد جماع بعد از نکاح ہے۔ جیسا کہ آپ نے رفاعہ قرظی کی سابقہ بیوی سے کہا تھا: «حتى تذوقي عسيلته ويذوق عسيلتك» یہاں تک کہ تو اس (نئے خاوند) کی مٹھاس چکھ لے اور وہ تیری مٹھاس چکھ لے۔

اسی طرح اللہ رب العالمین کا فرمان ہے: ﴿ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ ﴾ [الأنفال: ٦٠] اور کافروں کے لیے حسبِ استطاعت تیاری کر کے رکھو۔

تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت ان الفاظ سے فرمائی: «ألا إن القوة الرمي» یقیناً قوت تیر اندازی ہے۔

سنت کے ذریعے کتاب کا بیان صحیح ہونے پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: ﴿ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾ [النحل: ٤٤] اور ہم نے آپ ﷺ کی طرف ذکر کو اس لیے نازل کیا ہے تا کہ آپ ﷺ لوگوں کے لیے اس چیز کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

۲۔ **مفہوم کے ذریعے منطوق کا بیان:** جیسا کہ سورہ نور میں اللہ رب العزت کے منطوق فرمان ﴿ وَالزَّانِي ﴾ [النور: ۲] کا بیان مفہوم موافق کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ کے درج ذیل فرمان میں ہے: ﴿ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ [النساء: ۲۵] تو ان لونڈیوں پر آدھی سزا ہے، اس سزا کی نسبت جو آزاد عورتوں پر ہے۔

تو یہاں پر مفہوم موافق یہ ہے کہ غلام اس معاملے میں لونڈی کی طرح ہی ہے، اگر وہ زنا کا ارتکاب کرے تو اسے بھی پچاس کوڑے لگائے جائیں گے۔ تو اس مفہوم نے یہ بات واضح کر دی کہ سورہ نور میں زانی سے مراد آزاد مرد ہے۔

بیان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اسے ہر انسان جان لے:

بیان کے لیے یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے کہ اس بیان کے وقت ہی اسے تمام موجود مکلف بندے جان لیں بلکہ یہ بات جائز ہے کہ چند افراد اس سے لاعلم رہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اس فلاں کے لیے یہ بات بیان کردو کیونکہ اس کے لیے ابھی تک یہ بات ظاہر اور واضح نہیں ہوئی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بات واضح کی کہ اللہ رب العالمین کے اس فرمان کا عموم انبیاء کرام کو شامل نہیں ہے: ﴿ یوصِیکُمُ اللَّهُ فِي أَوْلادِكُمْ ﴾ [النساء: ۱۱] اللہ رب العزت تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں۔

آپ ﷺ نے یہ وضاحت اپنے اس فرمان کے ذریعے کی: «إنا معاشر الأنبياء لا نورث» ہم انبیاء کی جماعت وارث نہیں بناتی۔

تو فاطمہ رضی اللہ عنہا کا اس بیان سے عدم علم کی وجہ سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر نبی کریم ﷺ کی وراثت طلب کرنا اس بیان کے لیے قادح نہیں ہے۔

نسخ:

تعریف: لغت میں نسخ کا مطلب ہے زائل کرنا، "**نسخت الشمس الظل**"سورج نے سایہ کو منسوخ کر دیا، اسی معنی میں ہے۔ یعنی سورج نے سایہ کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ پر خود پہنچ گیا۔

اسی طرح: "**نسخت الريح الأثر**" ہوا نے قدموں کے نشانات منسوخ کر دیئے۔ یعنی انہیں مٹا دیا۔

نسخ کا لفظ نقل کے مشابہ چیز پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: "**نسخت الكتاب**" میں نے کتاب کو نسخ کر لیا ہے۔ یعنی میں نے ایسی چیز نقل کی ہے جو اس کتاب میں موجود چیز کے مشابہ ہے، اور میں نے اسے کسی دوسری جگہ پر رکھ دیا ہے۔

نسخ کا اصطلاحی معنی لغوی معنوں میں سے پہلے معنی کے ساتھ موافق ہے۔ کیونکہ اصطلاح میں نسخ کی تعریف یہ ہے: "**رفع الحكم الثابت بخطاب متقدم بخطاب آخر متراخ عنه**" متقدم خطاب کے ساتھ ثابت حکم کو متاخر خطاب کے ذریعے اُٹھا دینا / ختم کر دینا۔

تعریف کی وضاحت: 'الثابت' حکم کی صفت ہے۔ اور 'خطاب متقدم' ثابت کے متعلق ہے اور 'خطاب آخر' رفع کے متعلق ہے۔ اور 'عنہ' میں موجود ضمیر متقدم خطاب کے ساتھ ثابت کی طرف لوٹ رہی ہے۔

رفع حکم ایک جنس ہے جو نسخ اور اس کے علاوہ باقی چیزوں کو بھی شامل ہے۔ باقی قیود اس کے ساتھ اسی لیے لگائی گئی ہے تاکہ یہ صرف نسخ کے لیے ہی ہو۔ لہٰذا "**الثابت بخطاب متقدم**" کی قید سے برأۃ اصلیہ خارج ہو گئی تو اس طرح نماز، روزہ، حج اور زکاۃ کا واجب ہونا برأۃ اصلیہ کو ختم کرنے والا ہے، نسخ نہیں ہے۔

"**بخطاب آخر**" کی قید سے حکم کا پاگل پن یا موت کی وجہ سے ختم ہونا، نکل گیا۔

"**متراخ عنه**" کی قید سے وہ خطاب نکل گیا جو متقدم خطاب کے ساتھ ملا ہوتا ہے جیسا کہ تخصیص ہے۔ تو اسی وجہ سے تخصیص وغیرہ کا نام نسخ نہیں رکھا جاتا۔

آیئے! ہم اس تعریف کی مزید وضاحت اس مثال کے ذریعے کر دیتے ہیں۔ مثال یہ ہے کہ شروع اسلام میں مسلمانوں کو حکم تھا کہ جنگ میں دس کافروں کے بدلے میں اکیلا ایک مسلمان ہی مقابلہ کرے، پھر بعد میں اس حکم کو اس حکم کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا کہ اب دو کافروں کا مقابلہ ایک مسلمان کرے۔

تو اس مثال میں دس کافروں کے مقابلے میں ایک مسلمان کا کھڑا رہنا ایسا حکم تھا جو متقدم خطاب کے ذریعے ثابت تھا۔ اور وہ متقدم خطاب اللہ رب العالمین کا یہ فرمان ہے: ﴿ **إن يكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يغْلِبُوا مِائَتَينِ** ﴾ **[الأنفال:٦٥]** اگر تم میں سے دس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے۔

تو اس حکم کو بعد والے ایک خطاب کے ذریعے ختم کر دیا گیا، اور بعد والا خطاب اللہ رب العالمین کا یہ فرمان ہے: ﴿ **الآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإن يكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يغْلِبُوا مِائَتَينِ** ﴾ **الآية [الأنفال:٦٦]** اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری مشقت دور کر دی ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے تو اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

نسخ کا جائز اور واقع ہونا:

نسخ عقلاً جائز ہے اور شریعت میں واقع بھی ہوا ہے۔ اس کی دلیل اللہ رب العالمین کا یہ فرمان گرامی ہے: ﴿ **مَا نَنْسَخْ مِنْ آيةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا** ﴾ **[البقرة:١٠٦]** ہم جو بھی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلوا دیتے ہیں تو اسی جیسی یا اس سے بہتر آیت لے آتے ہیں۔ اور اللہ رب العزت کا یہ فرمان بھی اسی کی دلیل ہے: ﴿ **يمْحُو اللَّهُ مَا يشَاءُ وَيثْبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ** ﴾ **[الرعد:٣٩]** اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہتے ہیں ثابت رکھتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں، مٹا دیتے ہیں، اور اسی کے پاس کتاب کی اصل ہے۔

اور یہ فرمان باری تعالیٰ بھی دلیل ہے: ﴿ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ﴾ [النحل:۱۰۱]
اور جب ہم ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔
اسی طرح نبی ﷺ کی صحیح حدیث میں ہے: «كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فإنها تذكر الآخرة» میں تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا کرتا تھا، تو اب تم ان کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔
تو مذکورہ بالا آیات واحادیث نسخ کے عقلی اور شرعی طور پر واقع ہونے کے دلائل ہیں کیونکہ اگر یہ چیز ممنوع ہوتی تو قرآن وحدیث میں مندرجہ بالا قسم کے خطاب نہ ہوتے لیکن مذکورہ نصوص میں ایسا واقع ہوا ہے۔ اس لیے نسخ جائز ہے۔

تحریر اور حکم کا منسوخ ہو جانا:

اس اعتبار سے نسخ تین اقسام میں منقسم ہوتا ہے:

۱۔ **آیت کی تحریر کا منسوخ ہو جانا لیکن حکم باقی رہنا:** اس کی مثال رجم والی آیت ہے اور وہ یہ تھی: "«الشيخ والشيخة إذا زنيا فارجموهما البتة نكالاً من الله والله عزيز حكيم» "جب کوئی مرد وعورت زنا کریں تو انہیں لازمی طور پر رجم کرو، یہ اللہ کی طرف سے بطور سزا ہے اور اللہ رب العزت بہت غالب اور بہت حکمت والے ہیں۔
جیسا کہ اس آیت کا ذکر صحیحین میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ان کے خطبے میں ثابت ہے۔

۲۔ **آیت کے حکم کا منسوخ ہو جانا اور تحریر باقی رہنا:** اس کی مثال وہ آیت ہے جس میں بیوہ کی عدت کی مدت ایک سال تک بیان کی گئی ہے۔ اس آیت کا حکم منسوخ ہے لیکن مصحف میں یہ آیت موجود ہے اور اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے۔

۳۔ **آیت کے حکم اور تحریر دونوں کا منسوخ ہو جانا:** اس کی مثال یہ ہے کہ صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث آئی ہے کہ قرآن مجید میں پہلے دس معلوم رضعات نازل ہوئی تھیں جو حرمت پر دلالت کرتی تھیں، پھر انہیں منسوخ کر کے پانچ رضعات نازل کی گئیں، تو جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو یہ آیت ان آیات میں سے تھی جن کی تلاوت کی جاتی تھی۔

تو جب آیت میں دس رضعات کا حکم ہے، اس کا حکم اور تحریر دونوں منسوخ ہیں۔ اور پانچ رضعات والی آیت کا حکم تو موجود ہے لیکن ان کی تحریر منسوخ ہے۔ تو گویا کہ اس حدیث میں دو مثالیں جمع ہو گئی ہیں:

۱۔ جن کا حکم اور تحریر دونوں منسوخ ہے۔

۲۔ جن کی تحریر تو منسوخ ہے لیکن حکم باقی ہے۔ جیسا کہ آپ حدیث میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

بغیر کسی بدل کے نسخ:

جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ منسوخ حکم کے بدلے نئے حکم کا آنا ضروری نہیں ہے۔ ان کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے: پہلے پہل نبی کریم ﷺ سے سرگوشی کرنے سے قبل صدقہ کرنا ضروری تھا، بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا اور اس کے بدلے میں کوئی نئی چیز ضروری قرار نہیں دی گئی جیسا کہ سورۃ المجادلۃ کی آیات (۱۲۔۱۳) سے ثابت ہے۔

کسی بدل کے ساتھ نسخ:

بدل کے ساتھ حکم کی ان تین صورتوں میں کوئی نہ کوئی صورت ضرور ہو گی:

۱۔ یا تو ناسخ منسوخ سے زیادہ ہلکا ہو گا۔

۲۔ یا اس کے برابر ہو گا۔

۳۔ یا اس سے زیادہ بھاری (مشکل) ہو گا۔

پہلی دو صورتوں میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ تیسری صورت میں جمہور کا قول اس کے جواز کا ہی ہے۔ ان کی مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ **ہلکے حکم کے بدلے پہلے حکم کا منسوخ ہونا:** اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا منسوخ ہونا: ﴿إن يكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يغْلِبُوا مِائَتَينِ﴾ [الأنفال:٦٥] اگر تم میں سے دس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے۔

اس حکم کے ذریعے: ﴿ فَإِن يكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يغْلِبُوا مِائَتَينِ ﴾ [الأنفال:٦٦] تو اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے۔

تو دو کافروں کے مقابلے میں ایک مسلمان کا لڑائی کرنا دس کے مقابلے میں لڑائی کرنے کی نسبت زیادہ ہلکا ہے۔

۲۔ **مساوی حکم کے بدلے پہلے حکم کا منسوخ ہونا:** بیت المقدس کا قبلہ ہونا جو سنت سے ثابت تھا اس کا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ذریعے منسوخ ہونا: ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [البقرة:١٤٤] تو اب آپ ﷺ اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے۔

مکلف بندے کے فعل کے لیے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کی نسبت، کعبہ کی طرف منہ کرنا برابر ہے۔

۳۔ **بھاری حکم کے بدلے پہلے حکم کا منسوخ ہونا:** رمضان میں روزے رکھنے اور کھانا کھلانے کے اختیار کا لازمی طور پر روزے رکھنے کے حکم کے ذریعے منسوخ ہونا۔ اسی طرح صحابہ کرام پر جہاد کے وجوب کے ذریعے مشرکین سے قتال نہ کرنے اور اعراض کرنے کے حکم کا منسوخ ہونا۔

تو روزوں کا متعین ہونا روزے رکھنے اور کھانا کھلانے کے اختیار سے زیادہ بوجھل ہے، اسی طرح قتال کا واجب ہونا ترک قتال سے زیادہ بھاری ہے۔

کتاب یا سنت کا کتاب یا سنت کے ذریعے نسخ:

اس اعتبار سے نسخ کی کچھ اقسام ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ **قرآن مجید کا قرآن مجید کے ذریعہ نسخ:** اس قسم کے جائز ہونے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس کی مثالیں پیچھے گزر جانے والی عدت اور کفار سے مقابلے والی آیات ہیں۔

۲۔ سنت کا کتاب کے ذریعہ نسخ: اس کی مثال سنت سے ثابت بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے والے حکم کی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ذریعے منسوخی ہے: ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [البقرة:١٤٤] تو اب آپ ﷺ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے۔

۳۔ کتاب کا سنت کے ذریعہ نسخ: یہ قسم دو چیزوں پر مشتمل ہے:

ا۔ خبر واحد کے ذریعے کتاب کا نسخ: جمہور کا قول یہ ہے کہ ایسا ہونا ناجائز ہے، کیونکہ قطعی حکم کو ظنی حکم منسوخ نہیں کر سکتا۔

۲۔ متواتر سنت کے ذریعے کتاب کا نسخ: بعض اصولیوں نے اللہ رب العزت کے درج ذیل فرمان سے استدلال کرتے ہوئے اس کو ناجائز قرار دیا ہے: ﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ﴾ [البقرة:١٠٦] ہم جو بھی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلوا دیتے ہیں تو اسی جیسی یا اس سے بہتر آیت لے آتے ہیں۔

اس فرمان باری تعالیٰ سے ان کے استدلال کرنے کی صورت یہ ہے کہ سنت نہ تو قرآن جیسی ہے اور نہ ہی اس سے بہتر۔

جمہور کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ ایسا ہونا بالکل جائز ہے جیسا کہ ابن حاجب نے یہ بات نقل کی ہے۔ جمہور کے اس قول کی دلیل یہ ہے کہ: سنت ہو یا قرآن، سب کا سب اللہ تعالیٰ کی وحی ہے

۔

والدین کے لیے وصیت کا حکم نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے منسوخ ہے: «لا وصية لوارث» وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے۔

اس حدیث کے اس معنی پر اجماع واقع ہو چکا ہے۔

۴۔ سنت کا سنت کے ذریعہ نسخ: آحاد کے آحاد کے ذریعے اور متواتر کے متواتر کے ذریعے منسوخ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن آحاد کے ذریعے متواتر کے نسخ پر اختلاف ہے۔

سنت کے سنت کے ذریعے نسخ کی مثال نبی کریم ﷺ کا درج ذیل فرمان گرامی ہے: «كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها» میں تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا کرتا تھا، تو اب تم ان کی زیارت کیا کرو۔

متواتر اور آحاد کا متواتر اور آحاد کے ذریعے نسخ:

اس بارے میں نو (۹) ممکنہ صورتیں ہیں، جو کہ مذکورہ بالا بحث میں گزر چکی ہیں، اب ہم ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں:

۱۔ قرآن کے متواتر کا قرآن کے متواتر کے ذریعے نسخ۔

۲۔ متواتر سنت کا متواتر سنت کے ذریعے نسخ۔

۳۔ آحاد سنت کا آحاد سنت کے ذریعے نسخ۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں ناسخ، منسوخ کے برابر ہوتا ہے۔

۴۔ سنت آحاد کا قرآن کے ذریعے نسخ۔

۵۔ سنت آحاد کا متواتر سنت کے ذریعے نسخ۔

۶۔ متواتر سنت کا قرآن کے ذریعے نسخ۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں ناسخ، منسوخ سے زیادہ مرتبے والا ہوتا ہے۔

۷۔ قرآن کا متواتر سنت کے ذریعے نسخ۔

۸۔ قرآن کا اخبار آحاد کے ذریعے نسخ۔

۹۔ متواتر سنت کا اخبار آحاد کے ذریعے نسخ۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں ناسخ، منسوخ سے کم درجے کا ہوتا ہے۔

اجماع:

تعریف: لغت میں اجماع کا لفظ دو چیزوں پر بولا جاتا ہے:

۱۔ **اتفاق:** مثلاً: أجمع القوم علی کذا (لوگ فلاں چیز پر جمع ہو گئے)، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ اس چیز پر متفق ہو جائیں، یہ معنی ایک جماعت کے تصور سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

۲۔ **پختہ ارادہ:** مثلاً: فلاں نے اپنی رائے کو فلاں چیز پر جمع کر لیا ہے، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ اس چیز پر اپنے ارادے کو پختہ کر لے، یہ معنی مفرد اور جماعت دونوں کے تصور سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اصطلاح میں: "اتفاق جميع العلماء المجتهدين من أمة محمد صلى الله عليه وسلم بعد وفاته في عصر من العصور على أمر ديني" نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کسی بھی زمانہ میں آپ کی امت کے تمام مجتہد علماء کا کسی دینی معاملے پر متفق ہو جانا۔

تعریف کی وضاحت: «الاتفاق» کا لفظ ایک جنس ہے جو کئی چیزوں کے لیے عام استعمال ہوتا ہے، یہاں پر اس سے غیر مراد چیزوں کو بذریعہ چند قیود کے خارج کیا گیا ہے۔ ان قیود کا بیان درج ذیل ہے:

۱۔ تمام مجتہد علماء کی طرف اتفاق کے لفظ کو مضاف کر کے اس سے اس طالب علم کو خارج کیا گیا جو ابھی اجتہاد کے درجے کو نہ پہنچا ہو، چہ جائیکہ وہ عامی یا اس کے حکم میں جو افراد ہیں، وہ ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے کسی مسئلہ پر اکٹھے ہو جانے یا اختلاف کرنے کا اعتبار نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح اس قید سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اگر بعض مجتہد کسی مسئلہ پر اکٹھے ہو جائیں تو ان کے اکٹھ سے بھی اجماع نہیں کہلا سکتا۔

«من أمة محمد صلى الله عليه وسلم» کی قید سے دوسری امتوں کا اجماع خارج ہو گیا۔ اور امت سے مراد: امت اجابت ہے، امت دعوت نہیں۔

(**امت اجابت:** جو ایمان لا چکے ہیں، اور **امت دعوت:** جن کو ابھی دعوت دی جا رہی ہے۔)

" بعد وفاته صلى الله عليه وسلم " کی قید سے مراد اجماع کی ابتداء کے وقت کا بیان ہے۔ جو اجماع نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ہوا ہو، اس کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ تو نزول وحی کا زمانہ تھا۔

ہمارے اس قول " «في عصر من العصور» " میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبوت کے زمانے کے بعد کسی بھی زمانے میں کیا ہوا اجماع قابل قبول ہو گا، چاہے وہ صحابہ کے زمانے میں ہوا ہو یا اس کے بعد والے کسی زمانے میں۔

«على أمر ديني» کی قید سے امت کے مجتہدین کا کسی عقلی یا عادی مسئلہ پر اتفاق نکل گیا۔

اجماع کی مثالیں:

خاص وغیرہ کی بحث میں اجماع کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ابن حزم رحمہ اللہ کی کتاب مراتب الاجماع میں سے چند مسائل پیش خدمت ہیں، جن پر اجماع ہو چکا ہے۔ یہ مثالیں ہم نے اس کتاب کے مختلف ابواب سے لی ہیں:

۱۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ طلاق رجعی والی عورت کو عدت کے دوران رہائش اور خرچہ دیا جائے گا۔

۲۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ جماع اعتکاف کو فاسد کر دیتا ہے۔

۳۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کبائر کا مرتکب ہونا اور صغائر پر علی الاعلان عمل کرنا ایسی جرح ہے جس کی وجہ سے اس بندے کی شہادت مردود ہو جاتی ہے۔

۴۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ ماں کی موجودگی میں دادی / نانی وارث نہیں بن سکتی۔

۵۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔

۶۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ قتل خطا کے مرتکب سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

۷۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ طلاق رجعی والی مطلقہ جب تک وہ عدت میں ہے تب تک وہ اپنے خاوند کی وراثت پانے کی حق دار ہے، اسی طرح اس کا خاوند بھی اس کی وراثت پانے کا حقدار ہے۔

۸۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے لیے مباح سفروں میں سے کوئی سفر اپنے خاوند یا محرم کے ساتھ کرنا مباح ہے۔

۹۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ حرم میں محرم کے لیے جانوروں کو ذبح کرنا جائز ہے۔

۱۰۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ قرآن مجید فرقان حمید میں پندرہ سے زائد سجدات تلاوت نہیں ہیں۔

۱۱۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ عورت حیض کے دوران چھوڑے ہوئے روزوں کی قضائی دے گی۔

۱۲۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کوئی شخص کسی زندہ کی طرف سے روزہ نہیں رکھ سکتا۔

اجماع کی حجیت کے دلائل:

جمہور کا اس بارے میں یہ مذہب ہے کہ اجماع حجت ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا واجب ہے۔ اس مسئلہ میں نظام طوسی، شیعہ اور خوارج نے جمہور کی مخالفت کی ہے۔

جمہور نے اجماع کی حجیت پر کئی دلائل سے استدلال کیا ہے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿ **وَمَن يشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَينَ لَهُ الْهُدَى وَيتَّبِعْ غَيرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا** ﴾ **[النساء: ۱۱۵]** جو شخص باوجود راہ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بھی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے اور تمام مومنوں کی راہ چھوڑ کر چلے، ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہو اور دوزخ میں ڈال دیں گے، اور وہ (جہنم) ٹھکانہ کے اعتبار سے بہت بری جگہ ہے۔

اس آیت سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اللہ رب العالمین نے مؤمنوں کے راستے کو چھوڑنے والے کو عذاب کی وعید سنائی ہے، تو اس کا مطلب واضح ہے کہ مؤمنوں کے راستے کی پیروی واجب ہے، اور ایسا اسی وجہ ہے کہ سبیل المؤمنین حجت ہے۔

۲۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان گرامی ہے: «لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق...» الحدیث۔میری امت میں سے ایک گروہ حق پر جمار ہے گا۔۔الخ
اگر کسی زمانہ میں سب زمانے والے کسی باطل پر اکٹھے ہو جائیں تو اس زمانہ میں تو اس حدیث کا مصداق پیچھے رہ جائے گا کیونکہ اس زمانہ میں کوئی حق پر جمار ہنے والا باقی نہیں ہو گا، اور ایسا ہونا باطل ہے۔تو تمام زمانے والوں کا خلاف حق بات پر اجماع ہونا بھی باطل ہو گیا۔تو گویا یہ ایسی حجت بن گیا جس کی اتباع واجب ہے۔

اجماع کازمانہ:

اجماع کی تعریف میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اجماع نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کسی بھی زمانہ میں ہو سکتا ہے۔ اس میں صحابہ اور ان کے بعد والے زمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔یہی جمہور کا قول ہے۔ بعض نے اس کی مخالفت کی ہے اور اسے صحابہ کے زمانے کے ساتھ خاص کیا ہے۔یہ قول داؤد ظاہری اور ان کے پیروکاروں کا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ: صحابہ کی قلت تعداد اور ان کا ایک جگہ پر اکٹھے ہونا، اور ان کے اندر خواہش نفس کی پیروی پر ابھارنے والے اسباب کی کمی کی وجہ سے ان کا اجماع ہو سکتا ہے، اس پر اطلاع بھی مل سکتی ہے، اور اس اجماع سے حجت بھی پکڑی جاسکتی ہے۔بخلاف ان لوگوں کے جو بعد میں آئے کیونکہ ان کی کثرت تعداد، خواہشات نفس کا مختلف ہونا اور حکام کا مقابلہ کرنے میں ضعیف ہونا ان کے اجماع کو اور اس پر اطلاع کو عادتاً بعید قرار دیتا ہے۔
جمہور نے اس استدلال کا توڑ اس طرح نکالا ہے کہ شک وشبہ پیدا کرنے والوں کی کثرت اور ان کی خواہشات نفس کے مختلف ہونے کے باوجود ان کا باطل پر اکٹھا ہونا ثابت ہے اور اس پر اطلاع بھی پائی گئی ہے، جیسا کہ یہود نے محمد ﷺ کے انکار پر اجماع کیا تھا، تو مسلمانوں کا اجماع اس بات کا زیادہ حق درکھتا ہے کہ وہ واقع ہو اور اس پر اطلاع پائی جائے۔
جمہور کی دلیل یہ ہے کہ: اجماع کی حجیت پر جو دلیلیں مہیا کی گئی ہیں، وہ ساری ساری عام ہیں، ان میں کسی زمانے کی تخصیص نہیں ہے تو گویا اس بات پر اجماع ہے کہ ہر زمانے کا اجماع حجت ہے۔

کیا اجماع کے منعقد ہونے کے لیے یہ شرط ہے یا نہیں کہ اجماع کرنے والوں کا زمانہ ختم ہو جائے؟

جب کسی زمانے میں مجتہد علماء کسی مسئلہ پر اجماع کر لیں تو کیا ان کے یہ اجماع اسی وقت منعقد ہو جائے گا یا اس کے منعقد ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان (مجتہد علماء) کا زمانہ گزر جائے۔ اس بارے میں دو قول ہیں اور دونوں ہی امام احمد سے مروی ہیں۔ ان میں سے پہلا قول صحیح ہے اور یہی جمہور کا قول ہے اور اسی پر درج ذیل امور دلالت کرتے ہیں:

۱۔ کتاب وسنت میں موجود اجماع کے دلائل زمانہ کے ختم ہونے کو واجب قرار نہیں دیتے۔

۲۔ تابعین نے صحابہ کے اجماع سے ان کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ہی احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا، تو اگر زمانہ کا گزر جانا شرط ہوتا تو تابعین صحابہ کا زمانہ گزرنے سے پہلے ان کے اجماع سے حجت نہ پکڑتے۔

۳۔ اگر اجماع کرنے والوں کے زمانے کے گزرنے کی شرط لگائی جائے تو پھر قیامت تک اجماع نہیں ہو سکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر زمانہ میں افراد پیدا ہوتے، پروان چڑھتے اور اجتہاد کے درجے تک پہنچتے رہتے ہیں، اور ان کے گزرنے سے پہلے اور لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اور جو چیز انعقادِ اجماع کے ابطال پر دلالت کرے وہ خود باطل ہوتی ہے۔

اختلاف کا ثمرہ: اس مسئلہ میں اختلاف دو چیزوں پر مبنی ہے:

۱۔ زمانہ گزر جانے کی شرط پر بعض اجماع کرنے والوں کا اپنی رائے سے رجوع کرنا جائز ہو جائے گا اور اسے اجماع کے مخالف نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ اجماع تو واقع ہی نہیں ہوا۔

اور زمانہ کے گزرنے کی شرط نہ لگانے والے قول کے مطابق اجماع ہو جانے کے بعد کسی کے لیے اپنی رائے سے رجوع کا حق استعمال کرنا جائز نہیں ہو گا کیونکہ جو اجماع ہوا ہو گا وہ یا تو حق پر ہو گا یا

باطل پر۔ باطل پر اجماع ہو نہیں سکتا کیونکہ دلائل اس کے خلاف ہیں۔ تو لازمی بات ہے کہ جو بھی اجماع ہوا ہو گا وہ حق ہی ہو گا اور حق سے رجوع کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

۲۔ زمانہ گزرنے کی شرط پر تو ہر اس شخص کی موافقت ضروری ہو گی جو بھی اس زمانہ میں پروان چڑھے اور اجتہاد کے درجے تک پہنچ جائے ورنہ اس کے بغیر اجماع مکمل نہیں ہو گا کیونکہ اجماع کے منعقد ہونے کے لیے زمانہ کا گزر جانا شرط ہے۔

اور زمانہ کا گزرنا اگر شرط نہ ہو تو کسی کے لیے اجماع کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہو گا کیونکہ وہ تو منعقد ہو چکا ہے۔

اجماع کی بنیاد:

کتاب وسنت کی کسی بنیاد پر ہی اجماع ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اجتہاد پر بھی اجماع ہو سکتا ہے۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب «**معارج الوصول إلى أن أصول الدين وفروعه قد بينها الرسول ﷺ**» میں اس بات کو ممنوع قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ملتا جس پر اجماع ہو اور وہ نص سے ثابت نہ ہو۔ بعض الناس ایسے مسائل ذکر کرتے ہیں جن پر اجماع ہے لیکن وہ نص پر مبنی نہیں ہیں جیسا کہ مضاربت۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے بلکہ مضاربت تو لوگوں میں عموماً اور قریش میں خصوصاً جاہلیت کے زمانے سے مشہور چلی آ رہی تھی اور ان کی اکثر تجارت کی بنیاد اسی پر تھی۔ مالدار افراد اپنا مال اسی بنیاد پر کام کرنے والوں کے سپرد کیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی نبوت سے پہلے دوسروں کا مال لے کر (تجارت کے لیے) سفر کیے جیسا کہ آپ ﷺ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال لے کر سفر کیا۔

اور وہ قافلہ جس میں ابوسفیان تھا، اس قافلے کا اکثر مال بطور مضاربت کے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے پاس تھا۔ تو جب اسلام کا آغاز ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے برقرار رکھا اور آپ کے صحابہ کرام دوسروں کا مال بطور مضاربت لے کر سفر کرتے تھے اور آپ ﷺ نے کبھی ان

کو منع نہیں کیا۔ اور یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ سنت کی تین قسمیں ہیں: قولی، فعلی اور تقریری۔ تو جب نبی کریم ﷺ نے اس مضاربت کو قائم رکھا تو گویا کہ یہ سنت سے ثابت ہوئی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام ختم ہوا۔

اجماع کی اقسام:

اپنے وجود کے اعتبار سے اجماع کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اجماع قولی یا فعلی ۲۔ اجماع سکوتی

۱۔ جس مسئلہ پر اجماع ہو رہا ہو اس پر اجماع کرنے والے تمام افراد اپنے قول سے اس کی صراحت کریں یا ایسا فعل کریں جو اس نوزائیدہ اجماعی مسئلہ کے ان کے ہاں جائز ہونے پر دلالت کرے۔

اجماع ثابت ہونے کے قائلین کے ہاں اجماع کی اس قسم کے حجت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ اجماع کرنے والوں میں سے بعض کا قول یا فعل ملے اور ان کے ہاں عام ہو جائے اور باقی اس کے بارے میں کلام کرنے یا کوئی فعل کرنے سے خاموش رہیں یا جن لوگوں نے اجماع کیا ہے ان پر اعتراض نہ کریں۔

اس کی مثال عول کا مسئلہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران کچھ صحابہ کے مشورہ سے یہ فیصلہ کیا تھا اور باقی صحابہ خاموش رہے تھے۔

اجماع کی اس قسم میں اختلاف کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس اجماع کی مخالفت یا اس سے پیچھے ہٹنا جائز نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ نہ تو یہ اجماع ہے اور نہ ہی حجت۔ اور کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حجت تو ہے لیکن اجماع نہیں ہے۔

حجیت کے قائلین نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ تابعین کے ہاں جب صحابہ کرام سے اس طرح کی کوئی بات نقل ہو کر آتی تھی تو وہ اس سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ تو گویا کہ تابعین کا اجماع ہے کہ یہ حجت ہے۔

اور جس شخص کا یہ کہنا ہے کہ یہ حجت نہیں ہے چہ جائیکہ یہ اجماع ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس اجماع میں جو مجتہد خاموش رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اس اجماع کی موافقت میں ہوں اور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں اجتہاد ہی نہ کیا ہو یا اگر کیا ہو تو کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے ہوں، یا پھر وہ کسی ڈر کی وجہ سے خاموش رہے ہوں جیسا کہ عول کے مسئلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بات مروی ہے۔

اور اس وجہ سے بھی کہ اگر مثال کے طور پر علماء کسی برے فعل کے وقوع کے موقع پر خاموش رہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ وہ اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں کیونکہ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ انکار کے تین درجے ہیں، ہاتھ سے یا زبان سے یا دل سے۔ تو ان علماء کا ہاتھ اور زبان سے انکار نہ کرنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ اس بات کو دل سے بھی برا نہیں جانتے۔ تو اسی طرح کسی مجتہد کا کسی کام پر سکوت کرنا جو واقع ہو چکا ہو، اس کے اس کام پر راضی ہونے کی دلیل نہیں ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ اس نے فلاں مسئلہ پر اجماع سکوتی کر لیا ہے، جبکہ یہ بات نہ تو اس سے ثابت ہے اور نہ ہی اس کی منسوب کی جاسکتی ہے مگر اسی وقت جب اس واقع ہونے والے مسئلہ میں اس کی رضامندی معلوم کر لی جائے اور اسے تو صرف غیبوں کا جاننے والا اللہ رب العالمین ہی جان سکتا ہے۔

اخبار:

اخبار (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ) خبر کی جمع ہے۔ لغت میں یہ خَبار سے ماخوذ ہے جس کا مطلب نرم زمین ہے۔ خبر کو خبر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ فائدہ والی بات کو یوں پھیلاتی ہے جیسے مضبوط اور پختہ زمین کو جب گھوڑے وغیرہ روندیں تو وہ غبار اُڑاتی ہے۔

خبر بات کی ایک مخصوص نوع اور کلام کی اقسام میں سے ایک قسم ہے اور کبھی کبھی یہ قول کے علاوہ کسی اور چیز میں بھی استعمال ہوتی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

تخبرك العينان ما القلب كاتم

آنکھیں تجھے اس چیز کی خبر دے دیں گی جسے دل چھپاتے ہیں۔

خبر ہونے کے اعتبار سے خبر کی تعریف یہ ہے: "ما يحتمل الصدق والكذب لذاته" جو اپنی ذات میں سچ اور جھوٹ کا احتمال رکھے۔ یعنی اس میں خبر ہونے کی حیثیت سے سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی خارجی امر کی وجہ سے خبر کے سچ یا جھوٹ ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر بالکل سچی ہوتی ہے اور محالات کے بارے میں خبر جھوٹی ہوتی ہے، جیسا کہ اگر کوئی کہے کہ: "«الضدان يجتمعان»" متضاد اشیاء آپس میں جمع ہو جاتی ہیں۔

تو اس طرح کی کوئی چیز خبر ہونے سے نہیں نکلتی۔

محدثین کے ہاں خبر کی تعریف یہ ہے: "ما أضيف إلى النبي صلى الله عليه وسلم من قول أو فعل أو تقرير أو وصف خُلقي أو خَلقي" جو قول، فعل، تقریر، خَلقی یا خُلقی وصف آپ ﷺ کی طرف منسوب کیا جائے وہ خبر کہلاتا ہے۔

خبر کی سچ اور جھوٹ ہونے کے اعتبار سے تقسیم:

سچ اور جھوٹ ہونے کے اعتبار سے خبر تین اقسام میں منقسم ہوتی ہے:

① ایسی خبر جو یقینی طور پر سچی ہو۔ اس کی کچھ اقسام ہیں:

ا۔ وہ خبر جس کے راویوں کی تعداد تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہو۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دی ہوئی خبر۔

۳۔ ایسی خبر کی سچائی استدلال کے ذریعے معلوم ہو، جیسے اہل حق کا کہنا ہے کہ عالم حادث ہے۔

② ایسی خبر جو یقینی طور پر جھوٹی ہو۔ اس کی بھی کچھ اقسام ہیں:

۱۔ جس کا جھوٹا ہونا ہر بندہ ضروری طور پر جانتا ہو، جیسا کہ کسی کہنے والا کا قول ہے کہ: آگ ٹھنڈی ہوتی ہے۔

۲۔ وہ خبر کہ اگر صحیح ہوتی تو اس کو نقل کرنے کے اسباب متواتر طور پر جمع تھے۔ یا تو اس خبر کے اصولِ شریعت میں سے ہونے کی وجہ سے یا پھر اس کا عجیب وغریب معاملہ ہونے کی وجہ سے۔ مثال کے طور پر خطیب کا خطبہ دیتے وقت منبر سے گر پڑنا۔

۳۔ بغیر معجزہ کے رسالت کا دعویٰ کرنے والے کی خبر۔

③ وہ خبر جس کے سچا یا جھوٹا ہونے کا قطعی فیصلہ نہ کیا جا سکے۔ اس کی تین اقسام ہیں:

۱۔ جس خبر کے متعلق ظن غالب اس کے سچ ہونے کا ہو جیسے کسی عادل آدمی کی دی ہوئی خبر۔

۲۔ جس خبر کے متعلق ظن غالب اس کے جھوٹ ہونے کا ہو جیسے کسی فاسق کی دی ہوئی خبر۔

۳۔ جس میں شک ہو، جیسے کسی مجہول الحال آدمی کی دی ہوئی خبر، کیونکہ اس میں ترجیح دینے والے اسباب کی عدم موجودگی کی بناء پر دونوں احتمال برابر برابر پائے جاتے ہیں۔

خبر کی متواتر اور آحاد میں تقسیم:

خبر دینے والے تک خبر کے پہنچنے کے طریق کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ متواتر ۲۔ آحاد

متواتر:

تعریف: لغت میں اس کا مطلب ہے: ایک دوسرے کے پیچھے مسلسل آنے والا۔

اصطلاح میں اس خبر کو متواتر کہتے ہیں جس کو ایک ایسی کثیر جماعت روایت کر رہی ہو جن کا جھوٹ پر اتفاق اور موافقت کر لینا عادتاً محال ہو، وہ اپنے جیسی جماعت سے ہی روایت کر رہی ہو اور آخر تک ایسے ہی سلسلہ جاری ہو، یہاں تک کہ وہ محسوس تک جا پہنچے۔

متواتر کی شروط:

کسی خبر کے متواتر ہونے کے لیے چار شرطیں ہیں:

۱۔ یہ کہ اس خبر کے راوی کثیر تعداد میں ہوں۔

۲۔ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق اور موافقت کر لینا عادتاً محال ہو۔

۳۔ جہاں سے خبر چلی ہے، وہاں سے لے کر خبر دینے والے تک مذکورہ بالا دونوں شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

۴۔ ان رواۃ کا علم مشاہدہ یا سماع پر مبنی ہو۔

خبر متواتر کی اقسام:

خبر متواتر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ **متواتر لفظی:** یہ وہ خبر متواتر ہے جس کے تمام راوی معین الفاظ نقل کرنے میں مشترک ہوں۔ جیسا کہ یہ حدیث خبر متواتر لفظی کی مثال ہے: «**من كذب علي متعمدًا فليتبوأ مقعده من النار**» جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے، اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے۔ اسی طرح یہ حدیث بھی خبر متواتر لفظی کی مثال ہے: «**المرء مع من أحب**» آدمی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے محبت کرتا ہے۔

۲۔ **متواتر معنوی:** وہ خبر متواتر ہے جس کے راوی الفاظ نقل کرنے میں مختلف ہوں، لیکن ان سب کا معنی ومفہوم ایک جیسا ہو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے حوض کے بارے میں اور موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں احادیث ہیں۔

علم کی اس نوع کا بیان جس کا خبر متواتر فائدہ دیتی ہے:

خبر متواتر یقینی علم کا فائدہ دیتی ہے جس کے مان لینے میں انسان ایسا مجبور ہوتا ہے کہ اس کا انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ یہی بات حق ہے۔ کیونکہ ہم دور دراز کے مقامات جنہیں ہم نے کبھی نہیں دیکھا، ماضی میں گزرے ہوئے اشخاص کے بارے میں قطعی طور پر بتاتے ہیں، اور ہمارا یہ یقین ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ ہم نے خود مشاہدہ کیا ہوا ہے۔

آحاد:

تعریف: وہ خبر ہے جس میں متواتر کی گزشتہ بیان کردہ شرطیں نہ پائی جائیں۔

جس علم کا یہ فائدہ دیتی ہے: اخبار آحاد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کا اس بارے میں یہ کہنا ہے کہ اخبار آحاد نہ تو ذاتی طور پر یقینی علم کا فائدہ دیتی ہیں، نہ ہی قرائن سے مل کر۔ یہ صرف ظن کا فائدہ دیتی ہیں۔

اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ: خبر واحد میں اصل قاعدہ کلیہ تو یہی ہے کہ یہ ظن کا فائدہ دیتی ہے لیکن بعض اوقات یہ قرائن کی موجودگی میں قطعیت کا فائدہ بھی دیتی ہے۔ جیسا کہ اس خبر واحد کا صحیحین میں مروی ہونا ایک قوی قرینہ ہے۔ اور یہی بات زیادہ راجح ہے۔

اخبار آحاد کے ذریعے عبادت کرنا:

اخبار آحاد کے ذریعے عبادت کرنا عقلی طور پر جائز ہے اور نقلی طور پر اس کے دلائل موجود ہیں۔ چند ایک دلائل یہ ہیں:

۱۔ اسے قبول کرنے پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے۔ واقعات میں ان کا خبر واحد کی طرف رجوع مشہور ہے جیسا کہ وراثت میں دادی کے لیے چھٹا حصہ اور جنین کی دیت، عورت کا اپنے خاوند کی دیت میں وارث بننا، اہل قباء کا نماز میں ہی اپنے قبلہ سے پھر جانا، اہل کتاب کی طرح مجوسیوں سے جزیہ لینا اور اسی طرح وہ تمام افعال جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں سرانجام دیا کرتے تھے، یہ سب مسائل خبر واحد کے ذریعے ہی صحابہ کرام نے قبول کیے تھے۔

۲۔ اللہ رب العالمین کا فرمان گرامی ہے: ﴿ يا أَيها الَّذِينَ آمَنُوا إن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَنُوا ﴾ [الحجرات:٦] اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان عالی شان بھی ہے: ﴿ فَلَوْلا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِينذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيهِمْ لَعَلَّهُمْ يحْذَرُونَ ﴾ [التوبة:١٢٢] سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر گروہ میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور تا کہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس آئیں، ڈرائیں تا کہ وہ ڈر جائیں۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کا اطراف عالم میں احکام کی تبلیغ کے لیے ایک ایک بندے کو بھیجنا تواتر سے ثابت ہے، باوجود اس کے کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ جن کی طرف یہ ایک بندہ بھیجا جا رہا ہے، وہ اس کی وجہ سے مکلف بن جائیں گے۔

۴۔ مفتی کے اس قول کو قبول کرنے پر اجماع کا منعقد ہونا جس میں وہ اپنی رائے اور گمان سے خبر دیتا ہے تو جس چیز کے بارہ میں وہ ایسے سماع کے ذریعہ خبر دے رہا ہے جس میں کوئی شک نہیں اس میں اسکے قول کو قبول کرنا زیادہ اولی ہے۔

راویوں کی قلت اور کثرت کے اعتبار سے خبر واحد کی تقسیم:

راویوں کی قلت اور کثرت کے اعتبار سے خبر واحد تین اقسام میں منقسم ہوتی ہے:

۱۔ مشہور ۲۔ عزیز ۳۔ غریب

۱۔ مشہور وہ خبر واحد ہے جس کے راوی تواتر کے درجہ تک پہنچنے سے قاصر رہیں اور کسی بھی طبقہ میں تین سے کم نہ ہوں۔

اس کی مثال یہ حدیث ہے: «المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده» مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

۲۔ عزیز وہ خبر واحد ہے جس کی سند صرف دو راویوں تک رہ جائے ایسا خواہ بعض طبقات میں ہی ہو۔

اس کی مثال یہ حدیث ہے: «لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من ولده ووالده والناس أجمعين» تم میں سے کوئی ایک اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

۳۔ غریب وہ خبر واحد ہے جسکی سند میں روایوں کی تعداد صرف ایک رہ جائے خواہ یہ بعض طبقات میں ہی ہو۔

اس کی مثال سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جسے اکثر مصنفین اپنے کتب کے آغاز میں لاتے ہیں، اور وہ نبی کریم ﷺ کا مندرجہ ذیل فرمان ہے: «إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى» اعمال کا دارومدار تو صرف نیتوں پر ہے اور آدمی کے لیے تو صرف وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔

(اس خبر کو مطلقا غریب کہنا درست نہیں ہے کیونکہ أبو الحسن الطیوری نے طیوریات (۹۷۷:۳) میں اسی روایت کو بایں سند نقل فرمایا ہے: أَخْبَرَنَا أَحْمَدُ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ إِسْحَاقَ الْمَدَائِنِيُّ، حَدَّثَنَا نُوحُ بْنُ حَبِيبٍ الْقَوْمَسِيُّ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الْمَجِيدِ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، عَنْ مَالِكٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: " إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ " اور ابور الطاہر السلفی نے مشیخہ بغدادیہ کے جزء الخامس والثلاثون میں اسی روایت کو بایں سند نقل کیا ہے : حدثنا عمر بن محمد يعني الزيات، نا إبراهيم بن عبد الله بن أيوب المخرمي، نا نوح بن حبيب القومسي، ... الخ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت غریب مطلق نہیں ہے۔ یاد رہے کہ سیدنا عمر بن الخطاب اور أبو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی یہ روایت مروی ہے ۔م. ر. طاہر)

قبول اور رد کے اعتبار سے اخبار آحاد کی اقسام:

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ خبر متواتر تو قطعی طور پر مقبول ہے۔ رہی خبر واحد تو وہ صحیح بھی ہوتی ہے اور حسن بھی ہوتی ہے اور یہ دونوں اقسام ہی مقبول ہیں۔ اسی طرح خبر واحد ضعیف بھی ہوتی ہے اور یہ مردود ہوتی ہے۔ اور ایسا صحت اور تحسین کے قرائن اور رد کرنے کے اسباب کی بنیاد ہوتا ہے؛ ان میں سے ہر ایک قاعدہ کلیہ درج ذیل ہے:

۱۔ **صحیح لذاتہ:** وہ خبر واحد ہے جس کی سند عادل اور ضابط راوی کے ذریعے متصل ہو جس کا ضبط کامل ہو،، اور اس خبر واحد میں نہ تو شذوذ پایا جائے اور نہ علت۔

اور **صحیح لغیرہ:** وہ خبر واحد ہے جس کے اندر صحیح لذاتہ کی شروط تھوڑی سی کم ہوں لیکن یہ کمی کثرت طرق کی بناء پر پوری ہو جائے۔

۲۔ **حسن لذاتہ:** وہ خبر واحد ہے جس میں صحیح لذاتہ کی شروط کچھ کم ہوں اور اس کمی کی تلافی کثرت طرق کی بناء پر نہ ہو سکے۔

اور **حسن لغیرہ:** وہ خبر واحد ہے جس پر اس وقت تک توقف کیا جائے جب تک کوئی ایسا قرینہ نہ مل جائے جو اس کی قبول والی جانب کو راجح قرار دے دے۔ جیسا کہ مستور الحال کی حدیث جب اس کی طرق زیادہ ہو جائیں۔ (مستور الحال کی روایت اپنے ہی جیسوں کے تعدد طرق کی بناء پر حسن لغیرہ نہیں بنتی کیونکہ یہ ضعف شدید ہے۔ طاہر)

۳۔ **ضعیف:** وہ خبر واحد ہے جس کے اندر نہ تو صحیح کی صفات جمع ہو سکیں اور نہ حسن کی۔

خبر واحد کو رد کرنے اسباب یا تو سند میں سقوط کی وجہ سے ہوتے ہیں یا کسی راوی میں طعن کی وجہ سے، ان سب کی تفصیل علم اصول حدیث میں موجود ہے۔

علم اصول حدیث والے ایک راوی یا زیادہ راویوں کے گرنے کے درمیان فرق ڈالتے ہیں، اسی طرح سند کے شروع، درمیان یا آخر میں سقوط کے مختلف جگہ پر ہونے کی وجہ سے بھی مختلف اقسام بناتے ہیں۔

رہے اصولی تو وہ خبر واحد کو سند کے متصل ہونے یا منقطع السند ہونے کے اعتبار سے دو قسمیں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ مسند ۲۔ مرسل

۱۔ **مسند:** اِسناد کے باب سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ مسند کہتے ہیں ایک جسم کو دوسرے میں ملا دینا۔ پھر یہ دوسرے معانی میں استعمال ہونے لگا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: **أسند فلان الخبر إلى فلان** ۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ اسے اس کی طرف منسوب کرے۔

اصطلاح میں: اس خبر واحد کو کہتے ہیں جس کی سند شروع سے آخر تک متصل ہو، اس حیثیت سے کہ شروع والا راوی حدیث کو اپنے شیخ سے ایسے الفاظ سے روایت کرے جس سے یہ ظاہر ہو کہ واقعتاً ہی اس نے اپنے شیخ سے یہ روایت لی تھی، پھر اسی طرح اس کا شیخ اپنے شیخ سے اور وہ اپنے شیخ سے، یہاں تک کہ سند صحابی سے ہوتی ہوئی رسول اللہ ﷺ تک پہنچ جائے۔

۲۔ **مرسل:** اِرسال کے باب سے مفعول کا صیغہ ہے۔

اصطلاح میں: وہ خبر واحد ہے جس کو راوی ایسے شخص سے بیان کرتا ہے جس سے اس نے یہ حدیث سنی نہیں ہوتی۔ تو اس اعتبار سے ظاہری طور پر بعض راویوں کے سقوط کی وجہ سے اس حدیث کی سند متصل نہیں ہوتی، یہ بات برابر ہے کہ گرنے والے راوی ایک ہوں یا زیادہ اور اس بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ سند کے کس حصہ سے گرے ہیں۔

یہ تعریف اہل اصول کے ہاں ہے جس میں انہوں نے محدثین کی تعریف سے اختلاف کیا ہوا ہے۔ محدثین مرسل کا نام صرف اس حدیث کو دیتے ہیں جس میں صحابی کا واسطہ چھوٹا ہوا ہو، خواہ صرف صحابی کا واسطہ نہ ہو یا پھر اس کے ساتھ اور صحابی یا تابعی بھی گرا ہوا ہو۔ تو صحابی کی بھی مرسل روایت ہوتی ہے اور تابعی کی بھی۔

مرسل کی اقسام:

مرسل کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ صحابہ کی مراسیل ۲۔ تابعین کی مراسیل
۳۔ ان کے بعد آنے والوں کی مراسیل

اس کی تفصیل پیشِ خدمت ہے:

۱۔ **صحابی کی مرسل روایت:** یہ کہ صحابی کہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یوں فرمایا حالانکہ اس نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے سنی نہ ہو۔

صحابی کا نبی کریم ﷺ سے اس بات کو نہ سننے کا پتہ اس بات سے چل جاتا ہے کہ وہ صحابی دیر سے مشرف با اسلام ہوا تھا اور جس معاملے کے بارے میں وہ خبر دے رہا ہے وہ پہلے کی ہے اور وہ اپنے اسلام سے قبل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر بھی نہیں ہوا تھا۔ یا پھر صحابی چھوٹی عمر کا ہو اور اپنی ولادت سے بھی پہلے کے واقعات کی خبر دے۔ تو اس بارے میں یہ بات تو واضح ہے کہ اس نے یہ حدیث نبی کریم ﷺ کی زبانی نہیں سنی بلکہ کسی اور واسطہ سے سنی تھی، اور گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ وہ واسطہ کوئی صحابی ہی ہو سکتا ہے جو اس سے عمر میں بڑا تھا یا اسلام لانے میں مقدم تھا۔ جیسا کہ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی سن سات ہجری سے پہلے کے واقعات کے بارے میں احادیث ہیں کیونکہ وہ سات ہجری میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسی طرح ابن عباس، ابن عمر اور ان جیسے چھوٹے صحابہ کی شروع اسلام کے بارے میں روایات ہیں کیونکہ یہ تو پیدا ہی بعد میں ہوئے تھے۔ تو اس طرح کی مرسل روایات مقبول ہوں گی کیونکہ صحابہ سارے کے سارے عدول ہیں۔ لہٰذا ان روایات کا وہی حکم ہے جو مسند روایات کا ہے۔

۲۔ **تابعی کی مرسل روایت:** اور جب کوئی تابعی مرسل روایت بیان کرتا ہے اور اسے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر دیتا ہے تو یقیناً وہ اپنے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کوئی واسطہ گراتا ہے۔ اور یہ واسطہ صحابی کا بھی ہو سکتا ہے اور تابعی یا اس سے بھی کم درجے کے راوی کا۔

اگر وہ گمشدہ واسطہ صحابی کا ہے تو صحابہ کا عادل ہونا تو سب جانتے ہیں اگرچہ صحابی کا نام معلوم نہ بھی ہو، اور اگر وہ واسطہ کسی تابعی کا ہے تو اس پر تو کوئی حکم لگ ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ مجہول ہے اور کسی انسان پر حکم لگانا اس کی پہچان کی فرع ہے۔ یعنی پہچان ہو گی تو حکم لگے گا۔

سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی مراسیل کو جمہور نے اس سے مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ ان کی مراسیل کی جب بھی جانچ پڑتال کی گئی تو اس میں گمشدہ واسطہ صحابی ہی پایا گیا، تو گویا کہ ان کی مراسیل مسند کی طرح ہیں کیونکہ صحابہ سارے کے سارے عادل ہیں۔

۳۔ **غیر صحابی اور غیر تابعی کی مرسل روایت:** یہ وہ روایت ہے جسے سند کے درمیان میں کوئی شخص ایسے شخص سے روایت کرتا ہے جس سے اس کی ملاقات ہی نہیں ہوئی تو اس طرح وہ اپنے اور اس شخص کے درمیان ایک واسطہ کو گراتا ہے جس سے وہ روایت کرتا ہے۔

مرسل کا حکم:

۱۔ صحابہ کی مراسیل کے بارے میں ہم جان چکے ہیں کہ وہ مسند کے حکم میں ہیں، لہٰذا حجت ہیں اور جس شخص نے اس مسئلہ میں سختی کی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس بات کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ تمام ائمہ کا ابن عباس اور ان جیسے صغار صحابہ کرام کی مراسیل قبول کرنے پر اتفاق کرنا، یہ بات جاننے کے باوجود کہ یہ صحابہ کثرت روایت سے مشہور ہیں اور ان کی نبی کریم ﷺ سے بعض روایات مرسل ہیں۔

۲۔ اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ تمام صحابہ کی عدالت جانی پہچانی ہے اور وہ اکثر طور پر کسی صحابی سے ہی بیان کرتے ہیں۔ اگر کبھی وہ کسی غیر صحابی سے روایت کر بھی لیں تو اسی سے کرتے ہیں جن کی عدالت کو وہ جانتے ہیں۔

۲۔ رہی بات تابعین اور ان کے بعد والوں کی مراسیل کی تو وہ روایات امام مالک، امام احمد اور ایک روایت کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک حجت ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ

اور محدثین کے نزدیک سوائے سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی مراسیل کے باقی مراسیل حجت نہیں ہیں۔

راوی کا خبر نقل کرتے وقت اپنے اختیار سے کام لینا:

خبر نقل کرنے کی کیفیت میں راوی کی چار حالتیں ہیں:

۱۔ یہ کہ راوی انہی الفاظ کے ساتھ روایت کرے جو اس نے سنے تھے۔ روایت کرنے میں یہی حالت اصل ہے۔ اور یہ حالت سب حالتوں سے افضل ہے۔

۲۔ یہ کہ راوی سنی ہوئی خبر کا معنی روایت کردے۔ یہ حالت صرف اسی کے لیے جائز ہے جو الفاظ کے مدلولات اور مختلف معانی پر عبور رکھتا اور انہیں جانتا ہو۔

۳۔ یہ کہ راوی خبر کے بعض الفاظ حذف کردے۔ اگر محذوف کا مذکور سے کوئی تعلق ہو تو ایسا کرنا ممنوع ہے اور اگر محذوف کا مذکور سے کوئی تعلق نہ ہو تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بہت سے اسلاف نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے اور وہ روایت کے جتنے حصہ سے دلیل پکڑنا چاہتے تھے ،اسی کو بیان کرتے تھے، خصوصاً لمبی لمبی حدیثوں میں۔

۴۔ یہ کہ راوی نبی کریم ﷺ سے سنی ہوئی خبر میں کچھ الفاظ کا اضافہ کردے۔ یہ بات اس وقت جائز ہے جب زیادتی حدیث کے سبب کا بیان یا اس کے معنی کی تفسیر میں ہو۔ اس زیادتی کرنے میں شرط یہ ہے کہ راوی اس اضافہ کردہ حصہ کو واضح کرکے بتلائے تاکہ سامعین یہ سمجھ لیں کہ یہ حصہ نبی کریم ﷺ کا کلام نہیں ہے۔

ان معتبر شروط کا بیان جو راوی میں ہونا ضروری ہیں:

حدیث روایت کرنے والے راوی کے لیے چار شرطوں پر پورا اترنا ضروری ہے:

۱۔ **اسلام:** لہٰذا کافر کی روایت قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ دین میں تہمت زدہ ہے، ہاں اگر اس نے کفر کی حالت میں حدیث سنی اور اسلام کی حالت میں بیان کی تو وہ قابل قبول ہوگی جیسا کہ ابوسفیان کا ہرقل کے ساتھ قصہ ہے۔

۲۔ **روایت بیان کرتے وقت شریعت کا مکلف ہونا:** لہٰذا بچے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔ البتہ جو کچھ اس نے چھوٹی عمر میں عقل و شعور کی حالت میں سنا اور اسے بالغ ہونے کے بعد بیان کیا تو وہ روایت قبول ہوگی۔ ایسا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے صغار صحابہ مثلاً ابن عباس، ابن زبیر، محمود بن ربیع، حسن، حسین وغیرہ کی روایات قبول کرنے پر اجماع کی وجہ سے ہے۔

۳۔ **عادل ہونا:** لہٰذا فاسق کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔ کہا گیا کہ اس فاسق کی قبول ہوسکتی ہے جو ایک تو تاویل کرنے والا ہو اور دوسرا اپنی بدعت کی طرف دعوت دینے والا نہ ہو۔

۴۔ **اس کے اندر ضبط کا ہونا:** چاہے وہ ضبط صدر ہو یا ضبط کتاب۔ کیونکہ جو شخص احادیث لیتے وقت ان کو اس طرح محفوظ نہ رکھ سکا کہ انہیں اسی طرح سے بیان کردے جیسا اس نے سنی تھی تو اس کی روایت پر بھی اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ فاسق نہ بھی ہو۔

راوی کے لیے یہ شرطیں نہیں لگائی گئیں کہ وہ مرد ہو، آزاد ہو، بینا (دیکھنے والا) ہو یا فقیہ ہو۔

روایت کرنے کے صیغے اور الفاظ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں صحابی کے لیے چند الفاظ ہیں۔ قوت کے اعتبار سے ان کی ترتیب درج ذیل ہے:

۱۔ **یہ کہ صحابی یوں کہے:** میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حدیث بیان کی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ہم کلام ہوئے یا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے دیکھا یا اس طرح مزید الفاظ۔ ان الفاظ کے استعمال میں کسی قسم کے واسطہ کا احتمال باقی نہیں رہتا۔ اور اس طرح کی روایت بلا اختلاف حجت ہے۔

۲۔ **یہ کہ صحابی یوں کہے:** اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا۔ اس میں واسطہ ہونے کا احتمال ہے۔ ظاہراً اتصال پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ **یہ کہ صحابی یوں کہے:** اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حکم دیا اور اس بات سے روکا۔ اس میں واسطہ کا احتمال ہونے کے ساتھ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ صحابی اس چیز کو امر یا نہی خیال کرلے جو امر یا نہی نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ گزشتہ صورت کی طرح ہے۔ اور یقیناً

کوئی بھی صحابی یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا حکم دیا یا اس سے منع کیا، مگر سننے کے بعد ہی ایسا کرتا ہے جو حقیقتاً امر یا نہی ہوتا ہے۔

۴۔ **یہ کہ صحابی یوں کہے کہ:** ہمیں اس بات کا حکم دیا جاتا تھا یا ہمیں اس کام سے روکا جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں بھی سابقہ دونوں احتمال پائے جاتے ہیں کہ اس میں حکم دینے والے اور منع کرنے والے کی تعیین نہیں ہے کہ کیا وہ نبی کریم ﷺ ہیں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ اسے نبی کریم ﷺ کے حکم دینے اور آپ ﷺ کے منع کرنے پر ہی محمول کیا جائے گا۔ صحابی کا یوں کہنا کہ: "یہ بات سنت میں سے ہے" بھی اسی معنی میں ہے۔

۵۔ **یہ کہ صحابی یوں کہے کہ:** ہم ایسا کرتے تھے یا صحابہ کرام ایسا کیا کرتے تھے۔ تو اگر اس کی اضافت نبی کریم ﷺ کے زمانے کی طرف ہو تو یہ حجت ہوگا کیونکہ اس پر آپ ﷺ کی سکوت لازم ہوگا اور وہ سنت تقریری بن کر سنت میں شامل ہو جائے گا۔ ابو الخطاب نے کہا: صحابی کا یہ کہنا کہ وہ لوگ ایسا کیا کرتے تھے اجماع کے لیے نقل کیا گیا ہے۔

صحابہ کے علاوہ باقی لوگوں کی روایت کے الفاظ کے بھی کچھ مراتب ہیں، جن میں چند دوسروں سے زیادہ قوی ہیں۔ اور وہ درج ذیل ہیں:

پہلا مرتبہ: شیخ کا اپنے شاگرد کے سامنے حدیثیں بیان کرنا تاکہ وہ انہیں اس شیخ سے روایت کر سکے۔ حدیث بیان کرنے میں یہی مرتبہ سب سے اونچا ہے اور یہی رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے۔ شاگرد کو چاہیے کہ وہ روایت بیان کرتے وقت ان الفاظ کو استعمال کرے:

فلاں نے مجھے حدیث بیان کی یا مجھے خبر دی یا فلاں نے کہا اور میں نے اسے کہتے ہوئے سنا اور اسی جیسے دوسرے الفاظ استعمال کرے۔

دوسرا مرتبہ: شاگرد کا استاد کے سامنے حدیث پڑھنا اور استاد کا سنتے وقت 'جی ہاں' کہنا یا پھر خاموش رہنا۔ تو اس طرح بھی شاگرد کے لیے روایت کرنا جائز ہو جائے گا۔ اس میں بعض ظاہریہ نے اختلاف کیا ہے۔

اس مرتبہ کی روایت بیان کرتے وقت شاگرد یہ الفاظ کہہ سکتا ہے:

مجھے خبر دی یا مجھے حدیث بیان کی ،اس حال میں کہ وہ اس پر پڑھی جا رہی تھی۔ شاگرد کے لیے «قراءة عليه» کے الفاظ کو چھوڑنا جائز ہے یا نہیں، اس بارے میں دو قول ہیں اور دونوں ہی امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔

تیسرا مرتبہ: مناولہ ہے۔

مناولہ یہ ہے کہ شیخ اپنے شاگرد کو اپنی اصل کتاب یا اصل کتاب سے مقابلہ کردہ نسخہ دے دے یا شاگرد اپنے شیخ کی اصل یا اصل سے مقابلہ شدہ کتاب کو دیکھ لے۔ اور شیخ یہ کہے کہ: یہ میری فلاں سے روایت کردہ احادیث ہیں تو ان کو مجھ سے روایت کر۔

جمہور کا مذہب اس طرح روایت کرنے کے جواز کا ہے۔

اس مرتبہ کی روایت بیان کرتے وقت شاگرد یوں کہے گا:

مجھے کتاب دی، یا مجھے خبر دی یا مجھے حدیث بیان کی کتاب دے کر۔ بعض اصولیوں نے «مناولة» کا لفظ ترک کر دینے کی اجازت دی ہے۔

چوتھا مرتبہ: اجازۃ ہے۔

اوراجازۃ یہ ہے کہ شیخ اپنے شاگرد سے یوں کہے: میں تجھے فلاں کتاب روایت کرنے کی اجازت دیتا ہوں یا تیرے پاس مجھ سے سنی ہوئی جو بھی روایات ہیں، ان کے روایت کرنے کی میں تجھے اجازت دیتا ہوں۔

جمہور کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ اس طرح روایت کرنا جائز ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ اگر اس طریقہ کو باطل قرار دیا جاتا تو علم ضائع ہو جاتا۔

بعض نے یہ کہا ہے: اس طرح روایت کرنے کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر طالب علم طلب علم کے لیے سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔

اس مرتبہ کی روایت بیان کرتے وقت شاگرد یوں کہے گا: مجھے اجازت دی یا وہ کہے کہ اس نے مجھے خبر دی یا مجھے حدیث بیان کی اجازت کے طور پر۔ بعض نے «إجازة» کا لفظ چھوڑنے کی اجازت دی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے افعال اور آپ ﷺ کی تقریرات:

① نبی کریم ﷺ کے افعال:

نبی کریم ﷺ کے افعال چند اقسام میں منقسم ہوتے ہیں:

۱۔ وہ کام جو آپ ﷺ فطری تقاضا کی وجہ سے سرانجام دیتے تھے، جیسے کھڑا ہونا، بیٹھنا، کھانا پینا وغیرہ۔ تو ان کا حکم اباحت والا ہے۔ بندہ چاہے تو ایسا کرے، چاہے تو نہ کرے۔

۲۔ وہ کام جو فطری تقاضے اور شریعت ہونے کے درمیان متردد ہو یعنی معلوم نہ ہو سکے کہ ایسا آپ ﷺ نے فطری تقاضے کی بناء کیا ہے یا شریعت کا حکم ہی اس بارے میں یوں ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کا سوار ہو کر عرفات میں وقوف کرنا اور وادئ محصب میں پڑاؤ کرنا وغیرہ۔ تو ان احکام کو فطری تقاضے کی بناء پر کیا ہوا سمجھا جائے کہ یہ مباح ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے یا پھر اسے شریعت کا حکم سمجھا جائے کہ اس کی پیروی ضروری ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔

۳۔ وہ کام جو خاص آپ ﷺ کے لیے ہی جائز تھے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کے لیے اللہ رب العالمین کے اس فرمان کی وجہ سے چار سے زیادہ بیویاں رکھنا جائز تھا: ﴿ يا أَيهَا النَّبِي إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ ﴾ [الأحزاب: ٥٠] اے نبی ﷺ! ہم نے آپ کے لیے (زیادہ) بیویاں رکھنا حلال کر دیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے چار سے زیادہ شادیاں کر لیں۔ اسی طرح اپنے آپ کو ہبہ کرنے والی عورت سے نکاح بھی آپ ﷺ کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے جائز تھا: ﴿ خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ [الأحزاب: ٥٠] یہ کام خاص طور پر صرف آپ ﷺ کے لیے جائز ہے، مؤمنوں کے لیے نہیں۔

تو ان کاموں میں کوئی بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جو کام آپ ﷺ نے قرآنی نص کے بیان کے طور پر کیے، جیسا کہ آپ ﷺ نے چور کا ہاتھ کلائی کے پاس سے کاٹا، تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کا بیان تھا: ﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيدِيهُمَا ﴾ [المائدة:٣٨] چور مرد وعورت کے ہاتھ کاٹ دو۔

اسی طرح حج اور نماز کے افعال اللہ رب العالمین کے ان فرامین گرامی کا بیان تھا: ﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ﴾ [البقرة:٤٣] نماز قائم کرو۔

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيهِ سَبِيلاً ﴾ [آل عمران:٩٧] لوگوں میں سے جو بھی بیت اللہ کے حج کے لیے راستے کی طاقت رکھے، اس پر اللہ رب العالمین کا یہ حق ہے کہ وہ حج ضرور کرے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: «صلوا كما رأيتموني أصلي» نماز ویسے پڑھو، جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔اور «خذوا عني مناسككم» مجھ سے اپنے حج کے مناسک سیکھ لو۔

اس قسم کا حکم امت کے لیے مبَیَّن والا حکم ہے۔ ان میں سے جو چیزیں وجوب کا درجہ رکھتی ہیں، ان کی پیروی کرنا واجب ہے، اور جو اس کے علاوہ کسی اور درجہ میں ہیں، ان کی پیروی حسبِ حال ہو گی۔

۵۔ جو کام نہ تو آپ ﷺ نے فطری تقاضے کے طور پر کیا ہو، نہ ہی وہ بیان کے لیے ہو اور نہ ہی اس میں آپ ﷺ کی خصوصیت ثابت ہو تو اس کی مندرجہ ذیل دو قسمیں ہوں گی:

ا۔ اس کا نبی ﷺ کے لیے حکم معلوم کیا جائے گا کہ وہ کام آپ ﷺ کے لیے جائز تھا ، واجب تھا یا مباح تھا۔ تو جو حکم آپ کے لیے تھا، وہی حکم امت کے لیے بھی ہو گا جیسا کہ کعبہ کے اندر آپ ﷺ کا نماز پڑھنا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کرنا آپ ﷺ کے لیے جائز تھا تو امت کے لیے بھی یہ کام جائز ہی ہو گا۔

۲۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں پتہ نہ چل سکے کہ آپ کے لیے اس کا حکم کیا تھا۔ اس قسم کے بارے میں چار اقوال ہیں:

ا: **وہ کام واجب ہو گا۔** سب سے محتاط ترین عمل یہی ہے۔ یہ قول ابو حنیفہ، بعض شافعیہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کا ہے۔

ب: **وہ کام مندوب ہو گا۔** کام بالکل چھوڑنے پر کرنے کو ترجیح دی جائے گی۔ یہ قول بعض شافعیہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

ج: **وہ کام مباح ہو گا۔** کیونکہ یہی بات یقینی ہے۔ لیکن یہ ان کاموں میں ہو گا جن میں قرب (یعنی اللہ تعالی کا قرب حاصل کرنا یعنی عبادت) نہ ہو گا کیونکہ قرب (یعنی عبادت) کو اباحت سے موصوف نہیں کیا جاتا۔

د: **توقف کیا جائے گا۔** کیونکہ ہمیں اس کی مراد کا علم ہی نہیں ہے۔ یہ معتزلہ کا قول ہے۔ اور یہ سب سے کمزور ترین قول ہے کیونکہ توقف کرنے میں اقتداء کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ تو اس بحث سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ان چاروں اقوال میں سے صحیح بات اس کام پر عمل کرنا ہے واجب یا مندوب سمجھتے ہوئے کیونکہ اسی میں ہی رسول اللہ ﷺ کی اقتداء ہے۔

اہل اصول نے اس فعل کی مثال نبی کریم ﷺ کے نماز کی حالت میں جوتا اتار دینے والے فعل سے دی ہے۔ تو اس وقت تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اپنی اپنی جوتیاں اتار دی تھیں۔ نماز ختم ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان سے جوتا اتارنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے یہ جواب دیا: ہم نے آپ ﷺ کو کرتے دیکھا تھا، اس لیے ہم نے بھی ایسا کرلیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس تو جبریل علیہ السلام آئے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے جوتے میں گندگی لگی ہوئی ہے، میں نے تو اس لیے جوتا اتارا تھا۔

تو پھر آپ ﷺ نے انہیں اپنا جوتا اتارنے والے فعل پر اپنی اقتداء کی وجہ سے کچھ نہ کہا اور نہ ہی ان پر عیب لگایا حالانکہ وہ آپ ﷺ کے بتانے سے پہلے اس حکم کو نہیں جانتے تھے۔

۲ نبی کریم ﷺ کی تقریرات (کسی کام کو برقرار رکھنا):

آپ کا کسی کو برقرار رکھنا بھی آپ ﷺ کے فعل کی طرح ہی ہے کیونکہ ہر وہ کام جس کو آپ ﷺ نے برقرار رکھا اور کرنے والے پر اعتراض نہیں کیا، اس کا حکم آپ ﷺ کے فعل کی طرح ہے، وہ کام چاہے قولی ہو یا فعلی۔

یہ اس وقت حجت ہو گا جب کام کرنے والا شریعت کا مکلف ہو گا۔ اگر کوئی کافر یا منافق کوئی کام کرے اور آپ ﷺ اس پر خاموش رہیں تو یہ دلیل نہیں ہو گا جیسا کہ آپ ﷺ کا رمضان کے مہینے میں کسی ذمی کے کھانے پینے پر خاموش رہنا ہے۔

کسی کے قول پر آپ کی خاموشی کی مثال آپ ﷺ کا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس بات پر خاموش رہنا ہے کہ کافر مقتول سے چھینا ہوا مال مسلمان قاتل کو دیا جائے گا۔ فعل پر خاموشی کی مثال آپ ﷺ کا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو گوہ کھاتے دیکھ کر اور حسان رضی اللہ عنہ کو مسجد میں اشعار پڑھتے دیکھ کر خاموش رہنا ہے۔

یہ تو اس کی مثال ہے کہ جس کو آپ ﷺ نے خود دیکھا، سنا یا آپ تک بات پہنچی اور آپ نے اسے برقرار رکھا۔

اسی طرح آپ ﷺ کا خوش ہونا بھی آپ کے اس فعل کو برقرار رکھنے کی دلیل ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ مجزز مدلجی کا یہ قول سن کر خوش ہوئے تھے کہ جب اس نے زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے چادر سے باہر نکلے ہوئے پاؤں دیکھ کر کہا تھا: یہ پاؤں تو ایک دوسرے سے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نہ تو کسی باطل عمل کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر خوش ہو سکتے ہیں۔

اسی وجہ سے امام شافعی اور امام احمد رحمہا اللہ نے کہا ہے کہ قیافہ شناسی کے ذریعے بھی نسب ثابت ہو جاتا ہے۔

قیاس:

تعریف: لغت میں اندازہ اور برابری کو قیاس کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کہتے ہیں: میں نے کپڑے کا بازو کے ذریعے قیاس کیا۔ یعنی اس کا اندازہ لگایا۔

اسی طرح آپ کہتے ہیں: فلان یقاس بفلان یعنی وہ اس کے برابر ہے۔

اصطلاح میں: فرع کو حکم میں اصل کے ساتھ ان دونوں کو جمع کرنے والی کسی مشترک علت کی وجہ سے ملا دینا۔

جیسا کہ حنابلہ کے نزدیک چاول کو گندم کے ساتھ سود کی حرمت میں پیمانہ کی برابری کی علت کی وجہ سے ملا دینا۔ اور مالکیہ کے نزدیک ذخیرہ اور جمع کرنا مشترک علت ہے اور شافعیہ کے نزدیک دونوں کا غلہ ہونا مشترک علت ہے۔

قیاس کا انکار کرنے والوں پر قیاس کے اثبات کے دلائل:

جمہور کے نزدیک قیاس کی وجہ سے عبادت کرنا عقلا جائز ہے اور شریعت میں ایسا ہوا ہے۔ ائمہ اربعہ بھی اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے اس کے اثبات کے لیے کئی دلائل سے استدلال کیا ہے۔ چند ایک دلائل پیش خدمت ہیں:

۱۔ اللہ رب العالمین کا فرمان گرامی ہے: " ﴿ فَاعْتَبِرُوا يا أُولِي الأَبْصَارِ ﴾ [الحشر: ۲] " اے عقل والو! عبرت حاصل کرو۔

اعتبار عبور سے ہے، جس کا مطلب ہے ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف منتقل ہونا اور قیاس میں بھی اصل سے فرع کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے، لہٰذا یہ بھی مامور بہ (اس کا حکم دیا گیا) ہے۔

۲۔ نبی کریم ﷺ کا معاذ رضی اللہ عنہ کی بات کو درست قرار دینا بھی قیاس کے درست ہونے کی دلیل ہے۔ معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ جہاں پر وہ کتاب وسنت کا حکم نہیں پائیں گے، وہاں اپنے اجتہاد سے کام چلائیں گے۔ (یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ م. ر. طاہر) تو جہاں نص موجود نہ ہو وہاں اجتہاد کرنا منصوص کے ساتھ ملا کر ہی ہوتا ہے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ سے جب خثعمیہ عورت نے اپنے والدین کی طرف سے حج کرنے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: تیرا کیا خیال ہے، اگر تیرے والد محترم پر قرضہ ہوتا اور تو اسے ادا کر دیتی، تو کیا تیرا قرضہ ادا کرنا اسے کفایت کرتا؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا قرضہ اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔

تو گویا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے اللہ کے قرض کو مخلوق کے قرض پر قیاس کرنے پر خبر دار کرنا ہے۔

۴۔ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے روزے دار کا روزے کی حالت میں اپنی بیوی کو بوسہ دینے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے، اگر تو کلی کرے تو؟

تو یہ بوسہ کو کلی کرنے پر قیاس کرنا ہے۔

۵۔ اس آدمی کا قصہ بھی قیاس کے اثبات کی دلیل ہے جس کی بیوی نے کالا بچہ جنم دیا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے اس کے بیٹے کی مثال ان سرخ اونٹوں سے دی تھی، جن کی اولاد میں کالا اونٹ بھی ہوتا ہے۔ اس قصہ سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس آدمی کے بیٹے کو، جس کا رنگ اس کے رنگ سے مختلف تھا، اونٹ کے اس بچے پر قیاس کیا ہے جس کا رنگ باقی اونٹوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان مشترک علت بھی ذکر کی جو رگ کا کھینچنا ہے۔

قیاس کے ارکان اور ہر رکن کی تعریف:

قیاس کی تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے چار ارکان کا ہونا ضروری ہے، اور وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ **اصل**، جس پر قیاس کیا جاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا حکم ثابت ہوتا ہے اور اس کے ساتھ دوسروں کو ملا دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شراب کی حرمت ثابت ہے اور اس کے ساتھ نبیذ کو ملا دیا جاتا ہے۔

۲۔ فرع، جو اصل کے ساتھ ملائی جاتی ہے۔ لغت میں اس کو کہتے ہیں جو اپنے غیر سے پیدا ہوا اور اس کی بنیاد بھی اسی پر ہو۔ اور اصولیوں کی اصطلاح میں اس محل کو کہتے ہیں جسے حکم میں دوسرے سے ملانا مطلوب ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبیذ ہے، اس کو شراب کے ساتھ اس کے حکم میں ملانا مطلوب ہوتا ہے، اور وہ حکم تحریم کا ہے۔

۳۔ وہ **علت** جو اصل اور فرع کو جمع کرتی ہے، یہ اصل اور فرع کے درمیان مشترک معنی ہوتا ہے جو فرع کے لیے اصل کے حکم کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسا کہ نشہ نبیذ کو شراب کے حکم تحریم میں ملانے کی وجہ اور علت ہے۔

۴۔ وہ **حکم** جو اصل یعنی مقیس علیہ کے لیے ثابت ہے۔ اور یہ مطلوبہ حکم ہے جس میں فرع کو اصل کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قصاص کا حکم ہے جس کو کسی بھاری چیز کے ساتھ قتل کرنے میں بھی ثابت رکھا گیا ہے، لوہے کی تیز دھار چیز سے قتل کرنے کے ساتھ ملا کر۔

قیاس کی شرائط:

قیاس کے صحیح ہونے کے لیے چند شروط کا پایا جانا ضروری ہے۔

سب سے پہلے اصل کی شروط کا بیان ہے:

۱۔ اصل جو کہ مقیس علیہ ہے، اس میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اس میں جو حکم پایا جارہا ہے، وہ کسی نص یا اجماع سے ثابت ہو یا دونوں فریق اس پر راضی ہوں۔

۲۔ یہ کہ وہ قاعدہ عامہ سے ہٹا ہوا نہ ہو، جیسا کہ بیع عرایا اور سیدنا خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی گواہی کا دگنا ہونا، تو یہ دونوں اصل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان پر قیاس کیا جاسکے کیونکہ قیاس میں جو حکم ہے وہ برابر ہوتا ہے اور قاعدہ عامہ سے خارج حکم سب کے لیے برابر نہیں ہوتا۔ یہ بات ان اصولیوں کے خلاف ہے جو رخصتوں میں بھی قیاس کرنے کی اجازت دیتے ہیں، جیسا کہ وہ انگوروں اور انجیروں میں بھی بیع عرایا کو کھجوروں پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا دونوں شرطیں اس قول کے مطابق ہیں کہ اصل حکم ہی ہوتا ہے، حکم کا محل نہیں ہوتا۔

دوسرے نمبر پر فرع کی شروط کا بیان ہے، اور فرع کی بھی دو شرطیں ہیں:

۱۔ اصل کی علت اس میں پائی جاتی ہو کیونکہ یہ علت ہی تو اصل کے حکم کو اس فرع کی طرف منتقل کرنے والی ہے۔

۲۔ یہ کہ اس کا حکم نص میں موجود نہ ہو، کیونکہ اگر نص میں اس کا حکم موجود ہو تو پھر اسے دوسروں پر قیاس کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

تیسرے نمبر پر اصل کے حکم کی شرائط کا بیان ہے اور اس میں بھی دو شرطیں ہیں:

۱۔ یہ کہ فرع اس حکم میں اصل کے برابر ہو جیسا کہ چاول کو گندم کے ساتھ سود کی حرمت میں ملا دیا جاتا ہے۔ تو اگر فرع میں اصل سے زیادہ حکم پایا جائے یا اس سے کم پایا جائے تو قیاس کرنا صحیح نہیں ہو گا۔ مثلاً اصل کا حکم تو وجوب کا ہو اور فرع کا مندوب کا یا اس کے برعکس معاملہ ہو۔

۲۔ یہ کہ وہ حکم شرعی ہو، عقلی نہ ہو، کیونکہ عقلی حکم میں یقین طلب کیا جاتا ہے اس لیے وہ قیاس کے ذریعے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور قیاس تو صرف ظن کا فائدہ دیتا ہے۔

چوتھے نمبر پر علت کی شرائط کا بیان ہے اور اس میں بھی دو ہی شرطیں ہیں:

۱۔ یہ کہ علت متعدی ہو یعنی دوسری چیز تک پہنچ سکتی ہو اگر وہ اس سے قاصر ہو تو قیاس کرنا ناممکن ہو گا کیونکہ یہ فرع تک متعدی ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے اس کی علت یہ تھی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی بات کی تصدیق کرنے میں اتنی جلدی کی تھی کہ کوئی اور ان سے سبقت نہ لے جا سکا۔

۲۔ یہ کہ علت نشہ کی طرح ہو کہ جب بھی کسی چیز میں نشہ پایا جائے گا، وہ چیز حرام ہو جائے گی۔ اور غلہ اور پیمانے کی طرح ہو کہ جب کسی چیز میں غلہ یا پیمانہ پایا جائے گا، تو اس میں

اضافہ (یعنی ایک طرف سے کم اور دوسری طرف زیادہ مقدار کی بیع کرنا) حرام ہو جائے گا۔ تو اگر حکم کسی مانع کی وجہ سے ختم ہو جائے تو علت ختم نہیں ہو گی۔ جیسا کہ اگر کہا جائے کہ قتل عمد میں سرکشی اور ظلم قصاص کے لیے علت ہے اور اگر والد اپنے بیٹے کو عمداً ظلم کرتے ہوئے قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہاں پر حکم کو مانع کی وجہ سے ختم کیا گیا ہے اور وہ مانع اس شخص کا باپ ہونا ہے۔ یہ علت باپ کے علاوہ دوسروں میں ختم نہیں ہو گی۔ لہٰذا جب بھی ظلم کے ساتھ قتل عمد باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے پایا جائے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

اور اگر حکم بغیر کسی مانع کے علت سے ختم ہو جائے تو اس کا علت بنناہی صحیح نہیں ہو گا جیسا کہ اگر کہا جائے کہ مویشیوں میں زکاۃ مال پر قیاس کرتے ہوئے واجب ہو گی کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایک جمع کرنے والی علت موجود ہے اور اس کے ذریعے فقیروں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ تو یہاں پر یہ کہا جائے گا کہ ایسا قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات فقیر کی ضرورت پوری کرنے والی علت سے حکم ختم ہو جاتا ہے، مثلاً کے طور پر جواہر وغیرہ میں۔

قیاس کی قطعی وظنی میں یا جلی اور خفی میں تقسیم:

① قیاس قطعی یا جلی:

تعریف: جس میں کسی علت جامع کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے، بلکہ اس میں حکم میں مؤثر فارق کی نفی ہی کافی ہو جائے۔ جیسا کہ جاری پانی میں پیشاب کرنے یا کسی برتن میں پیشاب کر کے جاری پانی میں بہا دینے کے درمیان فارق کو ختم کرنا ہے۔ اس کی کچھ اقسام ہیں:

ا۔ جس میں فارق (فرق کرنے والی چیز) کی قطعی نفی کے ہوتے ہوئے منطوق (جس چیز کا حکم دیا گیا ہے) کی نسبت مسکوت عنہ (جس کا حکم دینے سے خاموشی اختیار کی گئی ہو) حکم کا زیادہ حقدار ہو۔ جیسا کہ پہاڑ کے برابر چیز کو مؤاخذہ میں ذرہ کے برابر چیز سے ملا دینا۔ اور والدین کی پٹائی کرنے کو حرمت میں اُف کرنے سے ملا دینا۔ اور جو چیز ایک خزانے سے کم اور دینار سے زیادہ ہو اسے بعض اہل کتاب کی طرف سے جب اسے امانتدار سمجھا جائے، ادا کرنے میں پہلی چیز کے

ساتھ ملا دینا اور بعض اہل کتاب کی طرف سے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے کی وجہ سے دوسری کے ساتھ ملا دینا۔

۲۔ جس میں فارق (فرق کرنے والی چیز) کی قطعی نفی کے ہوتے ہوئے مسکوت عنہ حکم میں منطوق کے برابر ہو، جیسا کہ یتیم کے مال کو غرق کر کے یا جلا کر ناجائز طور پر کھانے کے ساتھ ملا دینا۔

② قیاس ظنی یا خفی:

تعریف: جس قیاس میں علت جامعہ کی طرف دیکھنے کی ضرورت پڑے، جیسا کہ چاول کو سود کی حرمت میں پیمانہ کی علت جامعہ کی وجہ سے گندم کے ساتھ ملا دینا۔

اس بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ایک چیز کو دوسری چیز سے ملانا دو طریقوں سے ہوتا ہے: فارق کی نفی کر کے ملانا اور کسی علت جامعہ کی وجہ سے ملانا۔

علت کی تصریح ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے قیاس کی تقسیم:

اس اعتبار سے قیاس تین اقسام میں منقسم ہوتا ہے:

۱۔ **قیاس علت:** یہ وہ قیاس ہے جس میں اچھی مصلحت پر مشتمل مناسب وصف جمع ہو جائے تا کہ اس پر حکم مترتب کیا جا سکے۔ جیسا کہ نبیذ کو نشہ والی علت جامعہ کی وجہ سے شراب پر قیاس کرنا۔

۲۔ **قیاس دلالت:** یہ وہ قیاس ہے جس میں اصل اور فرع کے درمیان کچھ ایسی اشیاء جمع ہو جائیں جو علت پر دلالت اور اس کی طرف رہنمائی کریں۔ جیسا کہ نبیذ کا شراب پر بدبو اور جوش مارنے کی وجہ سے قیاس کرنا کیونکہ یہ دونوں چیزیں علت پر دلالت کر رہی ہیں جو کہ نشہ ہے۔

۳۔ **اصل کے معنی میں قیاس:** یہ وہ قیاس ہے جس میں صرف اس فارق کی نفی پر اکتفا کیا جاتا ہے جو حکم میں مؤثر ہوتا ہے، یہ مفہوم موافقت ہے اور قیاس جلی ہے جیسا کہ لونڈی

کو اس کے اپنا حصہ آزاد کرنے والے شریک کے علاوہ دوسرے شریک کا حصہ قائم رہنے پر غلام پر قیاس کرنا۔

قیاس شبہ:

جب فرع دو مختلف اصلوں کے مشابہ ہو جائے اور پتہ نہ چلے کہ اس کو کس کے ساتھ ملایا جائے تو اس وقت جو قیاس کیا جائے، اسے قیاس شبہ کہتے ہیں۔

اس کی مثال: جب کوئی غلام قتل ہو جائے تو کیا اب اسے آزاد مرد کے ساتھ ملا دیا جائے کہ اس کی دیت دی جائے یا پھر اسے سامان کے ساتھ ملا دیا جائے اور اس کی قیمت ادا کی جائے؟ تو اب یہ غلام مکلف انسان ہونے کے اعتبار سے آزاد مرد کے مشابہ ہے، اور آزاد مرد میں دیت دینی پڑتی ہے، اور بیچا جانے، تحفہ میں اور وراثت میں دیے جانے کے اعتبار سے یہ سامان کے مشابہ ہے، اور سامان میں اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ تو یہاں پر دو مختلف اصلوں کے مشابہ ہو گیا ہے۔ آزاد مرد کے مشابہ کہ اس میں دیت دینی پڑتی ہے اور سامان کے مشابہ کہ اس میں قیمت دینا واجب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام قیاس شبہ رکھا گیا ہے۔ پھر ہم نے غور کیا تو اسے ان میں سے ایک کے زیادہ قریب پایا، وہ اس حیثیت سے کہ اسے بیچا بھی جاتا ہے، تحفہ اور وراثت کے طور پر بھی دیا جاتا ہے، بلکہ اس کے مختلف اجزاء کی الگ الگ قیمت ہوتی ہے، تو ان سب چیزوں نے اسے مال سے مشابہ ہونے میں ترجیح دے دی ہے، لہٰذا اس کے بدلے چٹی بھرنی پڑے گی۔

علت میں اجتہاد ہونے کے اعتبار سے اس کی تقسیم:

اس اعتبار سے علت کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ علت کی تحقیق ۲۔ اس کی تنقیح

۳۔ اس کی تخریج

اصولیوں کی یہ عادت چلی آ رہی ہے کہ وہ ان تینوں مصادر کو علت کے القاب میں سے ایک لقب 'مناط' کی طرف مضاف کر دیتے ہیں۔ مناط 'نوط' سے مشتق ہے اور نوط کا مطلب ہے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ جوڑ دینا۔

اسی وجہ سے فقہاء نے مناط پر حکم کے متعلق کا اطلاق کیا ہے اور وہ اصل اور فرع کے درمیان علت جامعہ ہے۔

۱۔ **تحقیق المناط:** اس کا مطلب ہے کہ فرع میں علت کے وجود کو ڈھونڈنا اور تلاش کرنا اور اس فرع میں علت کی تحقیق میں اجتہاد کرنا، اس پر نص کے آجانے کے بعد یا اس کی ذات پر اتفاق ہونے کے بعد۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ یہ کہ کوئی قاعدہ کلیہ نص سے ثابت ہو یا بدیہی ہو اور مجتہد کسی ایک صورت میں علت کی تحقیق کرے اور اسے جزئیات پر منطبق کرے۔ نص میں قاعدہ کلیہ کی مثال اللہ رب العالمین کا یہ فرمان گرامی ہے: ﴿ فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ ﴾ [المائدۃ: ۹۵] تو اس شکار کرنے کا بدلہ اسی جیسا جانور ہے جیسا اس نے مارا ہے۔

اور وہ جزئی جس میں محرم کو جنگلی گدھے کا شکار کرنے کے بدلے ایک گائے دینا ضروری ہے کیونکہ یہ دونوں مجتہد کی نظر میں برابر ہیں۔ اس قسم پر سب کا اتفاق ہے اور یہ قیاس نہیں ہے۔

۲۔ اصل کی ذات میں علت پر اتفاق ہونے کے بعد فرع میں علت کو تلاش کرنا، جیسا کہ اس بات کا معلوم ہونا کہ ہاتھ کاٹنے کی وجہ اور علت چوری ہی ہے تو مجتہد کفن چور میں کفن چوری کرنے کی وجہ سے اسی علت کو ثابت کرکے یہی حکم لگائے گا کیونکہ اس نے بھی چور کی طرح حفاظت میں رکھی ہوئی چیز کو خفیہ انداز میں چرایا ہے۔

۲۔ **تنقیح المناط:** لغت میں تنقیح کانٹ چھانٹ اور صفائی ستھرائی کو کہتے ہیں تو تنقیح المناط ان چیزوں کو ختم کرکے علت کی کانٹ چھانٹ اور صفائی ستھرائی کرنے کو کہتے ہیں جو علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور ان کا علت میں کوئی اعتبار نہیں ہو سکتا۔

اس کی مثال اس اعرابی کا قصہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے پاس اس حال میں آیا کہ اپنا سینہ پیٹ رہا تھا اور بال نوچ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ: ہائے میں ہلاک ہوگیا، میں رمضان کے دن میں اپنی بیوی پر جا پڑا، ہائے میں ہلاک ہوگیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے اسے حکم دیا کہ ایک گردن کو آزاد کرو۔

تو اس آدمی کا دیہاتی ہونا، اور اس کا اپنی بیوی پر واقع ہونا، اور اس کا سینہ پیٹتے اور بال نوچتے ہوئے آنا، یہ سب اوصاف علت بننے کے لائق نہیں ہیں، لہٰذا ان کو لغو قرار دیا جائے گا۔

تو اگر کوئی شہری آدمی اپنی بیوی پر رمضان کے کسی دن میں صحبت کر بیٹھے اور پھر بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ فتوی پوچھنے کے لیے آئے تو اسے بھی کفارہ ادا کرنے کا ہی فتوی دیا جائے گا۔

۳۔ **تخریج المناط:** اس کا مطلب یہ ہے کہ شارع کسی حکم پر علت بیان کیے بغیر نص بیان کر دے تو مجتہد اپنے اجتہاد کے ذریعے اس سے علت تلاش کرے اور حکم کا محل دیکھے۔

مثال کے طور پر گندم کو دیکھیں کہ اس پر سود کی حرمت کا حکم بیان کر دیا گیا ہے، علت بیان نہیں کی گئی۔ تو اب مجتہد غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کرتا ہے کہ مثال کے طور پر اس کی علت پیمانہ ہے تو وہ اس پر چاول وغیرہ کو قیاس کر لیتا ہے۔

علت کے مسالک:

علت کے مسالک سے مراد وہ طرق ہیں جو علت پر دلالت کرتے ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہم ان میں سے صرف تین کو ذکر کریں گے۔

پہلا مسلک: علت پر نص صریح موجود ہو، اور ایسی نص صریح ہو جو علت پر ایسے الفاظ کے ساتھ دلالت کرے جن کو عربی زبان میں علت بتانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر «من أجل» کے الفاظ، جیسا کہ اللہ رب العالمین کے درج ذیل فرمان میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ﴿ مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴾ [المائدة: ۳۲] اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ بات فرض قرار دے دی تھی۔۔۔ الخ

اور نبی کریم ﷺ کے فرمان میں بھی یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں: «**إنما جعل الاستئذان من أجل البصر**» اجازت طلب کرنا، نظر غلط انداز کی وجہ سے ہی تو مقرر کیا گیا ہے۔

اسی طرح «الباء» ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ ﴾ الآية [المائدة: ۱۳] ان کے اپنے پختہ وعدے توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان لعنت اور پھٹکار ڈالی۔۔۔ الخ

اسی طرح «لام» ہے، جیسا اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد عالی میں ہے: ﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ [البقرة:١٤٣] اور اسی طرح ہم نے تمھیں معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ۔

اور اس فرمان ذیشان میں ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُونِ ﴾ [الذاريات:٥٦] میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

اسی طرح «كي» ہے، جیساکہ رب کائنات کے اس فرمان عالی شان میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے: ﴿ كَي لا يكُونَ دُولَةً بَينَ الأَغْنِياءِ ﴾ [الحشر:٧] تاکہ دولت مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے۔

دوسرا مسلک: نص علت کی طرف اشارہ کرے، اس کا نام 'ایماء' اور 'تنبیہ' رکھا جاتا ہے۔ اس میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ حکم اس وصف کے ساتھ اس انداز میں ملا ہوا ہو کہ اگر وہ وصف علت نہ ہو تو عقل مندوں کے ہاں کلام عیب دار ہو جائے۔ اس کی کچھ اقسام ہیں، چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ فاء کے ذریعے حکم کو علت پر معلق کر دینا، اس انداز میں کہ فاء علت پر داخل ہو اور حکم اس سے پہلے موجود ہو، جیسا کہ یہ بات آپ ﷺ کے اس فرمان میں موجود ہے جو آپ ﷺ نے اس حاجی کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا جس کو اس کی اونٹنی نے گرا کر مار ڈالا تھا۔ فرمایا: «وكفنوه في ثوبيه فإنه يبعث يوم القيامة ملبيا» اس کو اس کے انہی دو (احرام والے) کپڑوں میں کفن دے دو کیونکہ یہ قیامت کے دن تلبیہ پڑھتے ہوئے اٹھے گا۔

یا پھر فاء حکم پر داخل ہو اور علت اس سے پہلے موجود ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيدِيهُمَا ﴾ [المائدة:٣٨] چوری کرنے والے مرد وعورت دونوں کا ہاتھ کاٹ دو۔

اور اس فرمان باری تعالیٰ میں بھی ہے: ﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ﴾ [البقرة:۲۲۲] وہ آپ ﷺ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ فرمادیجئے کہ وہ ایک تکلیف اور بیماری ہے تو تم حالت حیض میں اپنی بیویوں سے الگ رہو۔

اسی کے ساتھ حدیث کی وہ قسم ملتی ہے جسے راوی 'فاء' کے ذریعے ترتیب دے کر بیان کرے۔ مثلاً: «سها النبي صلى الله عليه وسلم فسجد» نبی کریم ﷺ بھول گئے تو آپ نے سجدہ سہو کیا۔«زنا ماعز فرجم» ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے زنا کیا تو انہیں رجم کیا گیا۔

۲۔ حکم کا وصف پر شرط اور جزاء کے صیغے کے ذریعے مترتب ہونا۔ جیسا کہ اللہ رب العالمین کے مندرجہ ذیل فرامین گرامی ہیں: ﴿ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ﴾ [الطلاق:۲] جو اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیں گے۔

﴿ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ﴾ [الطلاق:۳] اور جو کوئی اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو جائیں گے۔

۳۔ یہ کہ شارع کسی حادثہ کے بعد، جس کے بارے میں سوال کیا جائے، کوئی حکم لگادے، جیسا کہ آپ ﷺ نے دیہاتی سے کہا: «أعتق رقبة» ایک غلام آزاد کر۔

تو یہ اس کے اس سوال کا جواب تھا جو اس نے کیا تھا کہ وہ رمضان کے مہینے میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے صحبت کر بیٹھا ہے۔ تو اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ روزے کی حالت میں اپنی بیوی پر واقع ہو جانا کفارہ واجب ہو جانے کی علت ہے۔

۴۔ یہ کہ حکم کے ساتھ کسی ایسی چیز کو ذکر کرنا کہ اگر اس کے ذریعے تعلیل بیان نہ کی جاتی ہو تو اس کا ذکر کرنا بے فائدہ ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ یہ کہ سائل کسی ظاہر الوجود واقعہ کے متعلق استفسار کرے، پھر وہ اس کے بعد حکم ذکر کرے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا جب آپ ﷺ سے تازہ کھجوروں کی

خشک کھجوروں کے بدلے بیع کرنے کے متعلق پوچھا گیا: «أينقص الرطب إذا يبس؟» کیا تازہ کھجوریں جب خشک ہوتی ہیں تو کم ہو جاتی ہیں؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اس کی تجارت کرنا صحیح نہیں ہے۔ تو اگر خشک ہو کر تازہ کھجوروں کا کم ہونا ممانعت کی علت نہ ہوتا تو اس کے بارے میں سوال کرنا بے کار ہوتا۔

۲۔ یہ کہ جواب میں سوال کے محل کی ہم مثل کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب خثعمی قبیلہ کی عورت نے والدین کی طرف سے حج کرنے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تمہارے والد صاحب پر کوئی قرضہ ہوتا اور تم اسے ادا کر دیتیں تو کیا تیری ادائیگی اسے فائدہ پہنچاتی؟ اس نے کہا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: «فدين الله أحق أن يقضى» تو اللہ کا قرض اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔ تو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں پر قرض ہی علت تھا۔

تیسرا مسلک: علت پر اجماع ہو۔ کہ جب بھی امت کے مجتہدین کا کسی چیز کے علت ہونے پر اتفاق پایا جائے تو اس چیز کو علت قرار دینا صحیح ہو گا۔ اس کی مثال نابالغ ہونا ہے۔ تو اس بات پر اجماع ہے کہ مال کی ولایت کے ثبوت کے لیے یہ علت ہے تو اس پر نکاح کی ولایت کو قیاس کیا جائے گا۔

دلائل کی ترتیب اور بعض کی بعض پر ترجیح:

① دلائل کی ترتیب:

ادلۃ، دلیل کی جمع ہے اور یہاں پر اس سے مراد کتاب وسنت، اجماع، قیاس، قول صحابی اور استصحاب میں سے وہ چیز ہے جس کے ذریعے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں۔

لغت میں ایک یا ایک سے زیادہ چیزوں کو اس جگہ رکھنا، جہاں رکھے جانے کی وہ مستحق ہیں ترتیب کہلاتا ہے۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ دلائل شرعیہ قوت میں مختلف ہوتے ہیں، تو ضرورت اس بات کی ہے ان میں سے سب سے طاقتور کی پہچان رکھی جائے تاکہ تعارض کے وقت اسے باقیوں کی نسبت آگے کیا جاسکے۔

دلائل شرعیہ کے درجات حسب ذیل ترتیب کے مطابق ہیں:

۱۔ **اجماع:** کیونکہ یہ قطعی اور غلطی سے معصوم ہوتا ہے اور منسوخ نہیں ہوتا۔ یہاں پر اجماع سے مراد وہ اجماع قطعی ہے جو اجماع قولی ہو اور دیگر اجماعوں کے خلاف تواتر یا مشاہدے کے ذریعے منقول ہو۔

۲۔ **قطعی نص:** اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ کتاب (یعنی قرآن مجید)

۲۔ سنت متواترہ جو کتاب کی قوت میں ہوتی ہے کیونکہ یہ علم قطعی کا فائدہ دیتی ہے۔

۳۔ **خبر آحاد:** اس میں سب سے پہلے صحیح لذاتہ کو ترجیح دی جاتی ہے، پھر صحیح لغیرہ کو، اس کے بعد حسن لذاتہ کو اور آخر میں حسن لغیرہ کو سامنے لاتے ہیں۔

۴۔ **قیاس:** امام احمد کے نزدیک قول صحابی کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا، یہ بات ان سے مروی دو روایتوں میں سے ایک میں ہے۔

اگر ان دلائل میں سے کوئی بھی دلیل کام نہ آئے تو اصل کو کام میں لایا جائے گا اور اصل یہ ہے کہ بندہ تکالیف سے بری الذمہ ہے۔ تو جب ان دلائل میں تعارض آجائے گا تو قوی کو دوسروں پر مقدم کیا جائے گا۔

تنبیہ: دو قطعی دلیلوں کے درمیان کبھی تعارض آہی نہیں سکتا الا یہ کہ ان میں سے ایک دوسرے کو منسوخ کرنے والی ہو، یا اس کی تخصیص کرنے والی ہو، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر قطعی دلیل علم و عمل کا فائدہ دیتی ہے تو جب یہ متعارض ہوں گی تو متضاد ہوں گی اور شریعت کبھی بھی متضاد باتوں کی حامل نہیں ہوتی۔

اسی طرح قطعی اور ظنی دلیل میں بھی کوئی تعارض نہیں ہوتا کیونکہ ظنی دلیل کبھی بھی قطعی دلیل کے آڑے نہیں آسکتی ۔ بلکہ اگر ظنی، قطعی کی تخصیص کرنے والی نہ ہو تو ہمیشہ قطعی کو ہی اس پر مقدم کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو اس کا تعلق عام کی تخصیص والے مسئلہ سے ہو گا، جیسا کہ یہ بحث پیچھے گزر چکی ہے۔ ایسی صورتحال میں قطعی کی وجہ سے ظنی دلیل کو ترک نہیں کیا جائے گا۔

اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے: ﴿ **حُرِّمَتْ عَلَيكُمُ الْمَيتَةُ وَالدَّمُ** ﴾ **[المائدة: ۳]** تم پر مردار اور خون حرام کر دیا گیا ہے۔

تو یہ قطعی الثبوت نص ہے جو ہر مردار اور ہر خون پر دلالت کرنے کے عام ہے، اس فرمان الٰہی کو اس حدیث کے ساتھ ملا کر عمل کیا جائے گا: «**أحلت لنا ميتتان ودمان، أما الميتتان فالجراد والحوت، وأما الدمان فالكبد والطحال**» ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں، مردار تو مچھلی اور ٹڈی دَل ہیں اور خون جگر اور تلی ہیں۔

اسی طرح سمندر کے مردار کے بارے میں حدیث ہے، جو کہ نبی ﷺ کا سمندر کے بارے میں فرمان ہے: «**هو الطهور ماؤه الحل ميتته**» سمندر کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

اس طرح خبر واحد کے ذریعے، جو کہ ظنی ہے، کتاب کے عموم کی تخصیص کی گئی ہے جو کہ قطعی ہے۔ تو یہاں پر قطعی کو ظنی پر مقدم نہیں کیا گیا۔

جب یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ دو قطعیوں اور ایک قطعی اور ظنی کے درمیان تعارض نہیں ہو سکتا تو اب صرف دو ظنیوں کی بات ہی رہ گئی ہے۔ تو جب دو ظنیوں کے درمیان تعارض ہو جائے تو اس میں ان دو میں سے ہی کوئی ایک حالت پائی جائے گی:

۱۔ ان میں جمع کا امکان ہو گا۔

۲۔ جمع کا امکان نہیں ہو گا۔

جمع کے امکان کی حالت میں ان کو جمع کیا جائے گا چاہے ان کی تاریخ معلوم ہو جائے، چاہے معلوم نہ ہو۔ اس کی مثال نبی کریم ﷺ کا میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرنا ہے۔ بعد میں جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ وہ جنبی تھیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: «إن الماء لا يجنب» پانی جنبی نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ وہ حدیث بھی ملائی جائے کہ آپ ﷺ نے اس بات سے منع کیا ہے کہ کوئی عورت مرد کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرے یا کوئی مرد عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرے۔ تو ان دونوں کو اس طرح جمع کیا جائے گا کہ اس نہی کو کراہت پر محمول کر لیا جائے اور فعل کو اباحت پر۔ اس تطبیق کی تائید بئر بضاعۃ والی حدیث سے ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ: « أن الماء طهور لا ينجسه شيء إلا ما غلب على ريحه وطعمه ولونه» پانی پاک ہی ہوتا ہے، اس کو کوئی چیز پلید نہیں کر سکتی مگر یہ کہ کوئی چیز اس کی بو، ذائقہ اور رنگ پر غالب آجائے۔

اور اگر جمع و تطبیق ممکن نہ ہو تو پھر اس کی دو حالتیں ہیں:

۱۔ تاریخ کو دیکھا جائے گا اور بعد والی حدیث کو ناسخ اور پہلی کو منسوخ کہا جائے گا۔ اس کی مثال طلق بن علی رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے کہ جب وہ مدینہ آئے، اس وقت مسجد نبوی ﷺ چھپر والی تھی تو انہوں نے ایک دیہاتی کو رسول اللہ ﷺ سے اس آدمی کے متعلق سوال کرتے ہوئے سنا جو وضو کے بعد اپنی شرمگاہ کو چھو لیتا ہے، کیا اس پر وضو کرنا واجب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: «وهل هو إلا بضعة منك؟» وہ تو تیرے جسم کا ایک ٹکڑا ہی ہے۔

اب اس کے ساتھ بسرہ بنت صفوان اور ابوہریرۃ رضی اللہ عنہما والی حدیث کو ملایا جائے تو تعارض بنتا ہے، وہ حدیث یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «من مس ذكره فليتوضأ» جو شخص اپنی شرمگاہ کو چھوئے، اس پر وضو کرنا لازمی ہے۔

اب ان حدیثوں میں موجود تعارض کو ختم کرنا اور ان کے درمیان تطبیق دینا ممکن نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ طلق والی حدیث پہلے کی ہے اور بسرہ اور ابوہریرۃ رضی اللہ عنہما والی حدیث بعد کی ہے۔ یہ پتہ یوں چلا کہ طلق والی حدیث اس وقت کی ہے جب مسجد نبوی ﷺ ابھی چھپر والی تھی اور یہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے آنے کے بعد پہلی تعمیر کے موقع پر تھا، اور ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سات ہجری میں مسلمان ہوئے تھے۔ تو اسی لیے بعض علماء نے پہلی حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے۔

۲۔ اگر تاریخ معلوم نہ ہو تو کسی خارجی امر کی وجہ سے ان میں سے ایک کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کی مثال وہ احادیث ہیں جو اندھیرے میں صبح کی نماز پڑھنے پر دلالت کرتی ہیں، ان حدیثوں کے ساتھ جو روشنی میں نماز پڑھنے پر دلالت کرتی ہیں۔ تو اب چونکہ ان میں تطبیق ممکن نہیں ہے اور نہ ہی تاریخ کا علم ہے اس لیے اندھیرے والی احادیث کو اللہ رب العالمین کے اس فرمان کے عموم کی وجہ سے راجح قرار دیا جائے گا: ﴿ وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] اپنے رب کی طرف سے مغفرت کی طرف لپکو۔

اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ کی میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے بارے میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے احرام کی حالت میں شادی کی، ابورافع کی حدیث کے ساتھ کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ حلال ہونے کی حالت میں شادی کی۔ ابورافع کا یہ بھی بیان ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان سفیر تھے۔ تو یہ ایک ہی واقعہ ہے اور دونوں حدیثوں کے زمانہ میں بھی فرق نہیں ہے۔ تو یہاں پر نہ تو نسخ کا دعویٰ ممکن ہے اور نہ ہی بیک وقت حلال ہونے اور مُحرم ہونے کی حالت کے درمیان تطبیق دینا۔ تو یہاں ہم ترجیح دیں گے اور ابورافع کی حدیث کو ابن عباس کی حدیث پر چند امور کی وجہ سے ترجیح دیں گے، چند ایک یہ ہیں:

۱۔ ابورافع رسول اللہ ﷺ اور میمونہ رضی اللہ عنہا کے درمیان سفارت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، لہٰذا وہ واقعہ کی حقیقت کو ابن عباس سے زیادہ جانتے تھے کیونکہ وہ اس قصہ کو براہ راست دیکھنے والے تھے۔

۲۔ خود ام المؤمنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے جو اس واقعہ کا ایک حصہ ہیں، ایک روایت ملتی کہ رسول اللہ ﷺ نے ان نے حلال ہونے کی حالت میں شادی کی تھی۔

(۲) ترجیح:

تعریف: دو متعارض طرفوں میں سے ایک کو دوسرے پر تقویت دینا۔ تو یہ طرف اس ترجیح کی بدولت دوسری طرف پر بلند ہو جائے گی۔

ترجیح کا طریقہ: ترجیح یا تو دوسری سند والے طریقہ سے ہوتی ہے یا کسی اور خارجی امر کی وجہ سے۔

پہلی قسم: سند والے طریقہ سے ترجیح کا بیان:

۱۔ زیادہ راویوں کو تھوڑے راویوں والی روایت پر مقدم کیا جائے گا، اسی طرح عالیٰ سند کو نازل سند پر مقدم کیا جائے گا۔

۲۔ احفظ، اضبط کی روایت کو حافظ، ضابط کی روایت پر مقدم کیا جائے گا۔

۳۔ مسند (متصل) کو مرسل پر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ واقعہ کے ایک کردار اور اس کو براہ راست دیکھنے والے کی راویت کو اجنبی کی روایت پر مقدم کیا جائے گا۔

ان کی مثالیں: ام المؤمنین میمونہ اور ابورافع رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ابن عباس کی روایت پر مقدم کیا جائے گا جیسا کہ ابھی پیچھے گزرا ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میمونہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کا ایک کردار تھیں اور ابورافع رسول اللہ ﷺ اور میمونہ رضی اللہ عنہا کے درمیان سفیر تھے۔

اسی طرح سیدہ عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی حدیث کہ جو فجر کے وقت جنابت کی حالت میں بیدار ہو اور سحری کرلے تو اس کا روزہ صحیح ہو گا، کو ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر مقدم کیا جائے گا جو ان دونوں کی حدیث کے خلاف حدیث بیان کیا کرتے تھے۔ کیونکہ عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے زیادہ اس بات کو جانتی تھیں وجہ اس کی یہ ہے کہ غسل جنابت اور اس کے ہم مثل گھر میں طے پانے والے امور کے بارے میں گھر والیاں ہی مشاہدہ کرسکتی ہیں ان لوگوں کے برخلاف جو گھر میں نہیں رہتے۔

دوسری قسم: متن والے طریقہ سے ترجیح کا بیان:

یعنی نص کو ظاہر پر مقدم کیا جائے گا اور ظاہر کو مؤول پر اور مؤول کو کسی صحیح قرینہ کی وجہ سے ان روایات پر مقدم کیا جائے گا جن پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، یا اگر موجود ہے تو باطل ہے۔

تیسری قسم: کسی خارجی امر کی وجہ سے ترجیح کا بیان:

۱۔ اس روایت کو مقدم کیا جائے گا جس کی دوسری نصوص گواہی دیں اس روایت کے برخلاف جن پر گواہی موجود نہ ہو۔ جیسا کہ صبح کے وقت اندھیرے میں نماز پڑھنے والی احادیث، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

۲۔ مثلا اصل کے حکم سے نقل کرنیوالی اور عبادت کو واجب کرنیوالی خبر کو اسکی نفی کرنیوالی خبر پر مقدم کیا جائے گا۔ کیونکہ نفی تو عقل کے مقتضی کے مطابق آتی ہے اور دوسری روایت بعد میں آتی ہے تو گویا وہ ناسخ ہوتی ہے، مثال کے طور پر بسرۃ اور ابوہریرۃ کی حدیث کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو اسے طلق بن علی والی حدیث پر مقدم کیا جائے گا کیونکہ یہ اصل کے تقاضہ کے مطابق آئی ہے۔

۳۔ اثبات والی روایت کو نفی والی روایت پر مقدم کیا جائے کیونکہ اثبات والے کے پاس زیادہ علم ہوگا جو نفی کرنے والے سے مخفی رہ گیا ہوگا۔

۴۔ ممانعت کا تقاضا کرنے والی روایت کو اباحت والی راویت پر مقدم کیا جائے گا کیونکہ احتیاط اسی میں ہے۔

اجتہاد اور تقلید:

① اجتہاد:

تعریف: لغت میں اجتہاد مکمل کوشش اور اپنی پوری وسعت وطاقت کو کسی کام میں لگا دینے کو کہتے ہیں۔ اور یہ ان کاموں میں ہی استعمال ہوتا ہے جن میں مشقت ہو۔ جیسا کہ کہا جاسکتا ہے کہ: اس نے پہاڑ ہٹانے کے لیے اجتہاد کیا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے کھجور کی گٹھلی یا لاٹھی اُٹھانے میں اجتہاد کیا۔ اور جَہد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) کا مطلب ہے طاقت اور مشقت اور جیم کے ضمہ کے ساتھ (جُہد) کا مطلب صرف طاقت ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان اسی معنوں میں ہے: ﴿وَالَّذِينَ لا يَجِدُونَ إِلاَّ جُهْدَهُمْ﴾ [التوبة: ٧٩] جو اپنی محنت مزدوری کے علاوہ اور کچھ نہیں پاتے۔

اصطلاح میں: کسی شرعی حکم پر یقینی یا ظنی فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دلائل میں اپنی پوری وسعت اور طاقت کو کھپا دینا اجتہاد کہلاتا ہے۔

اجتہاد کا حکم اور اس کی بنیاد:

اجتہاد فرض کفایہ کا حکم رکھتا ہے اور اس کی بنیاد اللہ رب العالمین کے اس فرمان پر ہے: ﴿وَدَاوُدَ وَسُلَيمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ (٧٨) فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيمَانَ وَكُلاًّ آتَينَا حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ [الأنبياء: ٧٨، ٧٩] اور داوٗد اور سلیمان (علیہما السلام کو یاد کیجئے) جبکہ وہ کھیت کے معاملہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو اس میں چر چگ گئی تھیں، اور ان کے فیصلے میں ہم موجود تھے (٧٨) ہم نے اس کا صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا۔ ہاں ہر ایک کو ہم نے حکم وعلم دے رکھا تھا۔

اور نبی کریم ﷺ کے اس فرمان گرامی پر ہے: «إذا اجتهد الحاكم فأصاب فله أجران» جب کوئی فیصلہ کرنے والا اجتہاد کرے اور درست فیصلہ کرے تو اس کے دوہرا اجر ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کا معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ فرمانا بھی اجتہاد کی درستی کی دلیل ہے جب انہوں نے کہا کہ جب وہ کتاب وسنت میں کوئی حکم نہیں پائیں گے تو اجتہاد سے کام چلائیں گے: «الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضي رسول الله» تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی، جس پر رسول اللہ ﷺ راضی ہیں۔

اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہے:

کسی زمانے کا ایسے مجتہد سے خالی ہونا جائز نہیں ہے جو اللہ کی رضامندی کی خاطر لوگوں کی طرف نازل شدہ وحی الٰہی کی دلائل کے ساتھ وضاحت کرے ۔ یہ بات ان لوگوں کے خلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اجتہاد کے ہمیشہ قائم رہنے پر نبی کریم ﷺ کا درج ذیل فرمان واضح دلالت کرتا ہے: «لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة» میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق پر ہمیشہ غالب رہے گا۔

تو اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے حق کی خاطر زندہ رہنے والوں کے وجود کی دنیا کے خاتمے تک ہمیشہ موجود ہونے کی خبر دی ہے۔

مجتہد بننے کی شرائط کا بیان:

۱۔ یہ کہ وہ اللہ رب العالمین کے وجود اور اس کے لیے تمام صفات کمال کے ثابت ہونے اور نقص اور عیب والی صفات کے نہ ہونے کے متعلق اچھی طرح جانتا ہو، اسی طرح وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور شریعت کی تصدیق کرنے والا ہو تاکہ وہ جو اقوال واحکام رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرے، اس کو ثابت کرنے والا ہو۔

۲۔ یہ کہ کتاب وسنت کی ان نصوص سے واقفیت رکھتا ہو جن کا تعلق احکام میں اجتہاد سے ہے اگرچہ وہ انہیں زبانی یاد نہ بھی رکھتا ہو۔

۳۔ یہ کہ وہ اجماعی اور اختلافی مسائل جانتا ہو تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان اجماعی مسئلہ کے خلاف مسئلہ پر عمل کرتا اور فتوی دیتا رہے۔

۴۔ یہ کہ وہ ناسخ اور منسوخ کا علم رکھتا ہو، تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ منسوخ پر عمل اور اسی پر ہی فتویٰ دیتا رہے۔

۵۔ یہ کہ وہ جانتا ہو کہ کن احادیث سے دلیل پکڑی جا سکتی ہے اور کن سے نہیں۔

۶۔ یہ کہ وہ بقدر ضرورت کلام کو سمجھنے کے لیے لغت اور نحو کا علم جانتا ہو۔

۷۔ یہ کہ وہ علم اصول فقہ اچھی طرح جانتا ہو کیونکہ یہ فن وہ ستون ہے جس پر اجتہاد کرتے وقت اعتماد کیا جاتا ہے۔

مجتہدین کی اقسام اور ہر قسم کے مجتہد کا مرتبہ:

مجتہدین کی کچھ قسمیں ہیں:

۱۔ **مجتہد مطلق:** یہ وہ مجتہد ہوتا ہے جس میں گزشتہ بحث میں بیان کردہ اجتہاد کی تمام شرطیں پائی جائیں۔ تو وہ دلیل کو ہی پکڑے، وہ جہاں بھی ہو۔ مجتہدین کی اقسام میں سے یہ وہ مجتہد ہیں جن کے لیے فتویٰ دینا اور جن سے فتویٰ طلب کرنا جائز ہے۔ انہی کے ذریعے امت کی طرف سے اجتہاد کا فریضہ ادا ہوتا ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: زمین کبھی بھی اللہ کی خاطر اللہ کے دلائل پر ثابت قدم رہنے والوں سے خالی نہیں ہوتی۔

۲۔ **مخصوص مذہب کا مجتہد:** یہ وہ وسیع علم والا عالم ہوتا ہے جو اپنے مذہب کے مطابق ان مسائل کی تخریج پر قدرت رکھتا ہے جن پر اس کے امام نے کوئی نص بیان نہیں فرمائی۔ تو جب بھی کوئی نیا حادثہ پیش آتا ہے اور یہ اپنے امام کی طرف سے اس پر کوئی نص نہیں پاتا تو اس کے لیے اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق اس مسئلہ پر اجتہاد کرنا اور اسے اپنے مذہب کے اصول کے مطابق تخریج کرنا ممکن ہوتا ہے۔

۳۔ **فتوی اور ترجیح دینے والا مجتہد:** یہ مجتہد سابقہ مجتہدین کی نسبت کم مرتبے والا ہوتا ہے کیونکہ اس کا اجتہاد صرف اسی بات پر ہوتا ہے کہ کون سی بات امام صاحب سے صحیح طریق سے منقول ہے۔ اس کے لیے ان مسائل کو حل کرنا ممکن نہیں ہوتا جن میں امام صاحب

نے نص بیان نہ کی ہو۔ اور جب اس کے امام کے کسی مسئلہ پر دو قول ہوں تو اکثر اوقات اس کا اجتہاد ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے پر ہوتا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کے قول کے مطابق: پہلی قسم کے مجتہدین کے فتوؤں کی مثال بادشاہوں کی مہر کی طرح ہے اور دوسری قسم کے مجتہدین کے فتوؤں کی مثال وزیروں کی مہر کی طرح ہے اور تیسری قسم کے مجتہدین کے فتوؤں کی مثال وزیروں کے مشیروں کی مہر کی طرح ہے۔

ایک وقت میں ایک مجتہد ہی درستگی کو پہنچنے والا ہوتا ہے:

مختلف مجتہدین میں سے ایک کی بات ہی حق ہوتی ہے اور باقی سب غلطی پر ہوتے ہیں۔ لیکن فروعات، جن پر کوئی قطعی دلیل نہ ہو، میں غلطی کرنے والے مجتہدین معذور سمجھتے جاتے ہیں اور وہ گناہگار بھی نہیں ہوتے بلکہ اجتہاد کرنے کے بناء پر ان کو ایک اجر بھی ملتا ہے۔یہی اہل حق کا قول ہے ان لوگوں کے برخلاف جو یہ کہتے ہیں کہ ہر مجتہد ٹھیک ہی کہتا ہے۔

اس جھگڑے کو چکانے کے لیے فیصلہ کن بات وہ حدیث ہے جس کی صحت پر سب محدثین کا اتفاق ہے، کہ جب کوئی حاکم فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرتا ہے اور درست فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کو دہرا اجر ملتا ہے اور اگر کوئی اجتہاد کرنے کے باوجود غلطی کر جائے تو اس کو بھی ایک اجر تو ضرور ملتا ہے ۔ یہ حدیث اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ حق ایک ہی ہوتا ہے اور بعض مجتہدین اس کے موافق ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اپنے اجتہاد میں درست بات کو پالینے والے کے لیے دوہرا اجر ملتا ہے، ایک اجتہاد پر اور دوسرا درست فیصلہ کرنے پر۔ اور بعض مجتہد کا اجتہاد اس حق کے خلاف ہو جاتا ہے۔تو ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس غلطی کرنے والے کو ایک اجر ملے گا جو اس کے اجتہاد کرنے کی بناء پر ہو گا۔ تو اس دوسری قسم کے مجتہد کا اجر حاصل کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ درست بات پر ہوتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مجتہدین کی دو قسمیں بنائی ہیں:

۱۔ درست فیصلہ کرنے والے

۲۔ غلطی کر جانے والے

تو اگر سارے مجتہد ہی درستگی کو پا لینے والے ہوتے، جیسا کہ کچھ لوگ ایسا کہتے ہیں، تو نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کی کی ہوئی اس تقسیم کا کوئی مطلب اور فائدہ نہ ہوتا۔

اجتہاد کی تقسیم:

صحیح قول کے مطابق اجتہاد کی بھی کچھ اقسام ہیں۔ تو ایک آدمی کبھی علم کی کسی ایک قسم میں مجتہد ہوتا ہے اور دوسری قسم میں مقلد ہوتا ہے جیسا کہ وہ شخص جو اپنی ساری وسعت اور طاقت علم الفرائض سیکھنے، اس کی دلیلوں کو جاننے اور کتاب و سنت سے اس کا استنباط کرنے میں لگا دیتا ہے تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ علم کی جس نوع میں وہ مجتہد ہے اس میں فتوی دے کیونکہ اس نے حق کو دلیل کے ساتھ پہچان لیا ہے اور درست بات تک پہنچنے کے لیے اپنی پوری کوشش کی ہے۔ تو اس علم کی اس نوع میں باقی انواع کی نسبت اس کا حکم مجتہد مطلق والا حکم ہو گا، اور اس کے لیے علم کی باقی انواع میں فتوی دینا جائز نہیں ہو گا کیونکہ جو شخص کسی فن میں کامل نہیں ہوتا / یا اس میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتا تو وہ اس معاملے میں عام آدمی کی طرح ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجتہادات:

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کی طرف سے اجتہاد کا ہونا جائز ہے اور ایسا ہوا بھی ہے۔ اس کے وقوع کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں: آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کا غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کو ان کے سچ یا جھوٹ کو جانے بغیر، پیچھے رہ جانے کی اجازت دینا۔ بدر کے قیدیوں کو قید کرنا اور ان سے فدیہ لینا۔ کھجوروں کو پیوند لگانے سے روک دینا۔ اور آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کا یہ فرمان کہ: «**لو استقبلت من أمري ما استدبرت لما سقت الهدي**» اگر میرا وہ معاملہ جو مجھے بعد میں پیش آیا، پہلے پیش آجاتا تو میں قربانی کے جانور ساتھ نہ لاتا۔

اسی طرح آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کا بدر کے چشمے سے پیچھے ہی پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ کرنا، یہاں تک کہ سیدنا حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے کہا: «**إن كان هذا بوحي فنعم، وإن كان الرأي والمكيدة فأنزل بالناس على الماء لتحول بينه وبين العدو**» اگر تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ کا ایسا کرنا وحی کی وجہ

سے ہے تو ہم حاضر ہیں اور اگر اپنی رائے اور جنگی چال کے طور پر ہے تو لوگوں کو لے کر چشمہ کے پاس پڑاؤ کیجئے تاکہ آپ ﷺ پانی اور دشمن کے درمیان حائل ہو جائیں۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لیس بوحي إنما هو رأي رأيته» یہ وحی نہیں ہے بلکہ یہ میری ایک رائے تھی۔ پھر آپ ﷺ نے حباب رضی اللہ عنہ کی بات پر رجوع فرمالیا۔ (یہ روایت ضعیف ہے۔م. ر. طاہر)

زمانہ نبوت میں اجتہاد کا ہونا:

ایک گروہ نے زمانہ نبوت میں اجتہاد کو مطلقاً ممنوع قرار دیا ہے اور دوسرے گروہ نے مطلقاً جائز قرار دیا ہے تو صحیح بات اس میں تفریق اور امتیاز کرنا ہے کہ جن لوگوں کے پاس آپ ﷺ نہیں تھے، ان کے لیے تو اجتہاد کرنا جائز تھا اور جن کے پاس آپ ﷺ موجود تھے، ان کے لیے آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر اجتہاد کرنا جائز نہیں تھا۔ اس بات کے دلائل میں چند ایک یہ ہیں:

معاذ رضی اللہ عنہ والا قصہ اور نبی کریم ﷺ کا ان کی تصدیق کرنا اور انہیں درست قرار دینا۔ اور آپ ﷺ کا بنی قریظہ کے بارے میں فیصلے کو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمادینا، جب انہوں نے سعد سے فیصلہ کروانے کا مطالبہ کیا تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کے جنگجوؤں کے قتل اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنانے کا فیصلہ دیا اور نبی کریم ﷺ نے اس تصدیق کی اور اسے درست قرار دیا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو برقرار رکھنا جب انہوں نے سردی کی شدت کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ﴾ [النساء: ۲۹] اپنے آپ کو خود ہی قتل نہ کرو۔

سے دلیل پکڑتے ہوئے غسل جنابت کیے بغیر تیمم کر کے لوگوں کو نماز پڑھادی تھی۔ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کو برقرار نہیں رکھا بلکہ واضح طور پر فرمایا تھا کہ تو نے حالت جنابت میں لوگوں کو نماز پڑھادی! ۔م. ر. طاہر)

اسی بات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام نے احرام کی حالت میں زیبرا (جنگلی گدھا) کھا لیا تھا جسے ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے شکار کیا تھا تو انہوں نے اسے اپنے اجتہاد کی بناء پر

ہی کھایا تھا۔اسی طرح اہل قباء کا نماز کے اندر ہی کعبہ کی طرف پھر جانا بھی اسی بات کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی دلیلیں ہیں، اختصار کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

② تقلید:

تعریف: لغت میں تقلید کسی چیز کو گردن میں اس طرح پہننے کو کہتے ہیں کہ وہ پوری گردن کا احاطہ کرلے۔ اس احاطہ کرنے والی چیز کا نام قلادہ ہے اور اس کی جمع قلائد ہے۔ کبھی یہ لفظ کوئی معاملہ کسی شخص کے سپرد کرنے پر بھی بولا جاتا ہے گویا کہ وہ معاملہ اس کی گردن میں قلادہ کی طرح پہنا دیا جاتا ہے۔

اصطلاح میں: "**هو قبول قول من ليس قوله حجة من غير معرفة دليله**" کسی ایسے شخص کی بات کو اس کی دلیل جانے بغیر مان لینا جس کی بات حجت نہ ہو۔ (تقلید کی یہ تعریف غلط ہے، کیونکہ یہ تعریف مانع نہیں ہے، اس تعریف کی زد میں مجتہد مطلق لوگ مثلا امام مالک، شافعی وغیرہ بھی آتے ہیں۔ تقلید اصطلاحی کی درست تعریف یہ ہے: **قبول قول ينافي الكتاب أو السنة** کسی ایسی بات کو قبول کرنا جو کتاب وسنت کے منافی ہو۔ م. ر. طاہر)

تو پہلی قید: "**هو قبول قول من ليس قوله حجة**" سے نبی کریم ﷺ کی بات اور اجماعی مسائل نکل گئے کیونکہ یہ بذات خود حجت ہیں۔

اور دوسری قید: "**من غير معرفة دليله**" سے اس شخص کی بات کو ماننا نکل گیا جس کی بات حجت نہ ہو لیکن وہ اپنی بات کی دلیل کو واضح اور ظاہر کردے کیونکہ اس وقت دلیل کے ذریعے بیان کی گئی بات کو مانا جائے گا، نہ کہ خود اس بندے کی بات کو۔ اس چیز کا نام اتباع رکھا جاتا ہے تقلید نہیں۔

کس کے لیے تقلید کرنا جائز ہے اور کس کے لیے نہیں؟:

ایسے مجتہد کے لیے تقلید کرنا جائز نہیں ہے جو اجتہاد کے ذریعے حکم پر ظن حاصل کرلے یا وہ عملی طور پر اجتہاد نہ کرے لیکن اجتہاد کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ عام آدمی کے لیے

تقلید کرنا جائز ہے اور ایسے طالب علم یا عالم کے لیے بھی تقلید کرنا جائز ہے جو ابھی تک مکمل علم میں یا علم کی کسی نوع میں اجتہاد کے درجے تک نہیں پہنچا کیونکہ جو شخص کسی فن میں کامل نہیں ہوتا / یا اس میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتا تو وہ اس معاملے میں عام آدمی کی طرح ہوتا ہے۔

(تقلید کتاب وسنت کے منافی قول کو ماننے کا نام ہے ، اور یہ کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے ، کتاب وسنت کے موافق کسی بھی شخص کی بات کو تسلیم کرنا خواہ اسکی دلیل کا علم ہو یا نہ ہو اتباع کہلاتا ہے، گو کہ عرف عام میں اسے بھی کچھ لوگ تقلید سے تعبیر کرتے ہیں۔م. ر. طاہر)

مفتی اور مستفتی:

مفتی کا لفظ اِفتاء کے باب سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ شیخ ابو طاہر مجد الدین محمد بن یعقوب کارزینی معروف بہ فیروز آبادی قاموس میں فرماتے ہیں: اس نے اس مسئلہ میں فتویٰ دیا کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو اس کے لیے واضح کر دیا۔ اور فتیا اور فتویٰ (فتحہ کے ساتھ) اس چیز کو کہتے ہیں جس کا مفتی فتوی دیتا ہے۔ صاحب قاموس کی بات ختم ہوئی۔

مفتی کا لفظ اس شخص پر بولا جاتا ہے جو اس طور پر حق کی خبر دینے والا ہو کہ اس پر وہ لازم نہ ہو۔ اہل اصول کے ہاں اس کا اطلاق مجتہد پر کیا جاتا ہے اور مجتہد وہ ہوتا ہے: جو کسی شرعی حکم پر یقینی یا ظنی فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دلائل میں اپنی پوری وسعت اور طاقت کو کھپا دے۔

مستفتی کا لفظ استفتاء کے باب سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور لغت میں فتویٰ طلب کرنے والے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں: جو مجتہد سے حکم شرعی طلب کرے۔ تو اس میں عام لوگ اور وہ طالب علم جو ابھی اجتہاد کے درجے تک نہیں پہنچے، سب آ جاتے ہیں۔

کتاب وسنت میں افتاء کا لفظ کسی کی طرف منسوب ہو کر آیا ہے؟:

کتاب مقدس قرآن مجید فرقان حمید میں افتاء کا لفظ اللہ رب العالمین کی طرف منسوب ہو کر آیا ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ **قُلِ اللَّهُ يفْتِيكُمْ** ﴾ **[النساء:۱۲۷]** اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں فتوی دیتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید میں قرآن کی طرف منسوب ہو کر بھی آیا ہے۔ جیسا کہ رب کائنات کے اس فرمان میں ہے: ﴿ **وَمَا يُتْلَى عَلَيكُمْ فِي الْكِتَابِ** ﴾ **[النساء:۱۲۷]** اور جو کچھ تم پر کتاب میں سے پڑھا جاتا ہے۔ یعنی وہ تمہیں فتوی دیتا ہے۔

نبی پاک ﷺ کی سنت مطہرہ میں یہ لفظ لوگوں کی طرف منسوب ہو کر آیا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے اس فرمان گرامی میں ہے: «**والإثم ما حاك في النفس وتردد في الصدر وإن أفتاك الناس وأفتوك**» اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور سینے میں تردد پیدا کرے اگرچہ لوگ تجھے اس کے متعلق خود فتوی دے دیں یا کہیں سے لا کر دے دیں۔

مقلد کس سے فتوی طلب کرے؟

مستفتی اس شخص سے فتوی طلب کرے جو اسکے ظن غالب کے مطابق فتوی دینے کا اہل ہو، کہ وہ اسے دیکھتا ہو کہ وہ لوگوں کو فتوی دیتا ہے اور لوگ اسکا احترام کرتے ہیں اور اس سے کچھ علم حاصل کرتے ہیں یا پھر کوئی عادل آدمی اسے (کسی کے صحیح مفتی ہونے کی) خبر دے۔

جب کسی جگہ پر کئی مفتی ہوں تو مقلد آدمی کس سے فتوی طلب کرے؟

جب کسی علاقے میں کئی ایک مجتہد ہوں تو مقلد کی مرضی ہے کہ جس سے چاہے فتوی طلب کرلے، اس پر سب سے زیادہ علم والے کے پاس جانا ضروری نہیں ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ افضل سے سوال کرنا ضروری ہے۔ پہلے قول والوں کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین میں سے مفضول، فاضل کی موجودگی میں ان کے مشہور ہونے کے باوجود فتوی دیتے تھے اور ایسا کئی بار ہوا ہے اور کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا تو گویا کہ فاضل سے فتوی طلب کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود مفضول سے فتوی طلب کرنے کے جواز پر اجماع ہے۔اور دوسرے قول والے اس بات سے دلیل پکڑی ہے کہ جو افضل ہوتا ہے وہ شریعت کی پوشیدہ باتوں کو دوسروں کی نسبت زیادہ اچھے طریقے سے جانتا ہے۔

مفتی اور مستفتی کے آداب:

مفتی اور مستفتی دونوں کے لیے چند آداب مقرر کیے گئے ہیں۔ پہلے مفتی کے آداب ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ یہ کہ وہ حسن نیت والا ہو کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور جس شخص کی نیت ہی اچھی نہ ہوگی نہ تو خود اس پر علم کا نور ہوگا اور نہ ہی اس کی بات پر۔

۲۔ یہ کہ وہ بردبار، پروقار اور حوصلے والا ہو کیونکہ یہ خوبیاں علم کا لباس اور اس کی خوبصورتی ہیں۔ جب کسی مفتی کے اندر یہ صفات نہ ہوں تو اس کا علم لباس سے عاری جسم کی طرح ہوتا ہے۔

۳۔ یہ کہ وہ لوگوں کے پاس موجود چیزوں سے پرہیز کرے کیونکہ اگر یہ ان کے ہاں سے کوئی چیز کھائے گا تو وہ کئی گنا زیادہ اس کا گوشت کھائیں گے اور خون پئیں گے۔

۴۔ یہ کہ اس کے پاس لوگوں کی پہچان کا ملکہ ہو کیونکہ جب اس کے اندر چہرہ شناسی کا علم نہ ہو گا تو وہ ظالم کو مظلوم تصور کر لے گا یا مظلوم کو ظالم تصور کرے گا، اس طرح اس پر مکر و فریب غلبہ پالے گا اور اس طرح مفتی صاحب اصلاح سے زیادہ فساد پھیلائیں گے۔

۵۔ یہ کہ اس کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہے اور وہ اسی کے سامنے عاجزی اختیار کرے اور زیادہ سے زیادہ دعا اور استغفار کرے تاکہ اسے درست بات اس کے دل میں ڈالی جائے اور درستگی کے راستے اس کے لیے کھولے جائیں۔

۶۔ یہ کہ وہ فیصلہ کی نسبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف کرنے سے ممکن حد تک بچے الا یہ کہ اس کے پاس کوئی واضح نص ہو، جس پر وہ اس معاملے میں اعتماد کرتا ہو۔

۷۔ یہ کہ وہ اپنے فتوؤں میں ایسے شخص سے مشورہ کرے جو علم و دین میں اس سے پختہ ہے، کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جب بھی کوئی نیا معاملہ پیش آتا تو وہ اپنے پاس موجود صحابہ سے اس بارے میں مشورہ کرتے تھے اور بسا اوقات تو وہ سب کو جمع کر لیتے اور پھر ان سے مشاورت کرتے۔

۸۔ یہ کہ وہ اپنے علم پر عمل کرے کیونکہ عمل ہی علم کا پھل ہے اور عمل کے بغیر انسان کا علم اس کے خلاف حجت بن جاتا ہے۔

مستفتی کے آداب:

۱۔ یہ کہ وہ عام طور پر اچھے اخلاق سے آراستہ ہو اور مفتی صاحب کے حضور تو خصوصاً اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ اور ایسا نہ کرے جیسا کہ عوام کی عادت ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے

مفتی صاحب کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، نہ ہی اس سے ایسی بات کہے جو مناسب نہ ہو مثال کے طور پر یوں کہے کہ فلاں مفتی صاحب نے تو مجھے اس مسئلہ میں یوں فتوی دیا ہے۔ اسی طرح مفتی صاحب سے ایسے وقت سوال نہ کرے جب مفتی صاحب بے چین و بے قرار، غمگین یا غصے وغیرہ کی حالت میں ہوں۔

۲۔ یہ کہ مفتی صاحب سے فضول قسم کے سوال نہ پوچھے اور نہ ہی بہت زیادہ سوال کرے کہ مفتی صاحب اکتا کر تھک جائیں۔

یہ وہ آخری بات تھی جس کو اس کتابچہ میں پیش کرنا اللہ رب العالمین نے ہمارے لیے آسان کیا تھا۔

اول و آخر تمام تعریفیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہیں اور درود و سلام ہوں اللہ کے نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ اے اللہ! ہمارے پیارے نبی جناب محمد ﷺ، ان کی آل پر، ان کے صحابہ پر اور قیامت تک ان کی احسان کے ساتھ پیروی کرنے والوں پر اپنی برکتیں نازل فرما۔ آمین۔

الفہرست